وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد	:	60
شمارہ	:	2
ربیع الاوّل		1432ھ
فروری		2011ء
فی شمارہ		25/-

اج ائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُ یر
حافظ عاکف سعید

نائب مُ یر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ م کزی انجمن خ ام القرآن ہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ربیع الاوّل ۱۴۳۲ھ
فروری ۲۰۱۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ علیہ

قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالت
دین اور فریضۂ دینی
سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں

مشمولات

✿ **عرضِ احوال** ______ 3

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے! — ایوب بیگ مرزا

✿ **بیانُ القرآن** ______ 5

سورۃ الانعام (آیات ۵۱ تا ۷۰) — ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **تذکرہ و تبصرہ** ______ 21

قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالت — خرم مرادؒ

✿ **پیغامِ سیرت** ______ 35

دین اور فریضۂ دینی: سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں — محمد فہیم

✿ **اُسوہ وسیرت** ______ 48

رسول اکرم ﷺ۔ نبی رحمت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

✿ **حسنِ انتخاب** ______ 58

کلامِ صدیق رضی اللہ عنہ — حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

✿ **تعمیرِ سیرت** ______ 60

کذب بیانی — عتیق الرحمٰن صدیقی

✿ **نقد و نظر** ______ 71

تحریک تجدد اور متجددین (۳) — حافظ محمد زبیر

✿ **دعوتِ فکر** ______ 85

دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کا مسئلہ — مولانا عصمت اللہ

✿ **کلمۂ حکمت** ______ 92

سلف صالحین کے حوالے سے راہِ اعتدال — مولانا ابوالکلام آزاد

❁ ❁ ❁

وقت کے تقاضوں کی تکمیل...

ہمدرد ایک صدی سے زیادہ نہ صرف آپ کے دُکھ اور تکلیف میں فرحت و تسکین بخش رہا ہے بلکہ آپ کا ہمدم اور خیر خواہ بھی ہے۔ انسانیت کی خدمت اور پرورش کے لئے نہایت وسیع اقسام کی ہربل اور طبی مصنوعات موجود ہیں، جو صحت بخش ہونے کے ساتھ شفا بخش بھی ہیں۔

ہمدرد اس دور کے تقاضوں کی تکمیل، ترقی یافتہ سائنسی طریقوں کی مدد سے کرنے کے لئے سرگرم کار ہے۔

صحتِ انسانی کی بقاء اور بیماریوں کے اس سفر کے ساتھ ساتھ "ہمدرد" نے انسان دوست ادارے کی حیثیت سے تعلیم اور ثقافت کے فروغ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

ہمدرد لیباریٹریز (وقف) پاکستان

ISO 9001: 2008 & ISO 22000: 2005 CERTIFIED

Al-Majeed, Hamdard Centre, Nazimabad No. 3, Karachi-74600, Pakistan. Tel: (+9221) 36616001-4, Fax: (+9221) 36611755, Email: headoffice@hamdard.com.pk

Website: www.hamdard.com.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرَّحِیم

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے!

تیونس کے سابق صدر زین العابدین بن علی قریباً چوبیس سال بلاشرکت غیرے عوام پر مسلّط رہے۔ وہ روشن خیالی کے نام پر ملک میں مغربی تہذیب اور بے حیائی کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ وہ بری طرح کرپشن میں ملوث تھے۔ ان کی اہلیہ لیلیٰ چارٹرڈ جہاز کے ذریعے فرانس اور یورپ کے دوسرے شہروں میں شاپنگ کے لیے جاتی تھیں۔ ملک میں وافر معدنی ذخائر ہونے کے باوجود صدر اور اس کے سسرالی رشتہ داروں کی لوٹ مار نے عوام پر زندگی تنگ کی ہوئی تھی، لیکن گزشتہ ہفتے عوامی غیظ وغضب سے بچنے کے لیے صدر کو ملک چھوڑنا پڑا اور انہیں سعودی عرب نے پناہ دی۔ اپنے عوام پر ظلم وستم توڑنے میں انہیں امریکی آشیرباد حاصل تھی، لیکن جب انہوں نے فرار ہو کر امریکہ آنے کی خواہش کی تو امریکہ نے معذرت کر لی۔ بظاہر انتہائی معمولی سی بات سے ملک میں مظاہرے شروع ہوئے۔ ایک گریجوایٹ نوجوان جو نوکری نہ ملنے پر سبزی کی ریڑھی لگانے پر مجبور ہو گیا تھا، پولیس نے روایتی انداز میں اس کی ریڑھی کو قبضہ میں لے لیا اور سبزی ضائع کر دی۔ وہ اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے خودسوزی کر لی۔ تیونس میں میڈیا پر تو پابندیاں عائد ہیں، لیکن جب اس جلتے ہوئے نوجوان کی تصویریں انٹرنیٹ پر آئیں تو عوام بھڑک اٹھے اور بات اس قدر بڑھی کہ کنٹرول کرنا دشوار ہو گیا۔ ظالم صدر نے اپنی حکومت بچانے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے۔ محبت وشفقت کے منافقانہ طریقوں سے لے کر بدترین تشدد سے حالات کو نارمل کرنے کی کوشش کی، لیکن عوامی ریلے کے سامنے ایک نہ چلی اور بالآخر وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

قارئین کرام! صرف گزشتہ تیس چالیس برس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں کئی کرپٹ، ظالم، عوام فروش اور عیاش حکمران انجام بد کو پہنچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایران کے رضا شاہ پہلوی، فلپائن کے مارکوس، سپین کے جنرل فرانکو اور سب سے زیادہ پاکستان کے صدر ایوب، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل پرویز مشرف جو اپنے وقت میں فرعون بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کسی پرندے تک کو پر مارنے کی جرأت نہ تھی اور ان کی حکومتوں کا ظاہری استحکام دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ

اور ان کی نسل اور ذرّیت تاابد حکمران رہے گی، لیکن جب اللہ ربّ العزت نے چاہا انتہائی معمولی نوعیت کے واقعات نے ان کی ہمالہ کی طرح بلند اور چٹان کی طرح مضبوط حکومت کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیا۔

حیوان اور پرند و چرند سب تجربات سے سبق سیکھتے ہیں، لیکن اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انسان کب سمجھے گا کہ کبریائی اور ہمیشگی صرف اللہ ربّ العزت کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ انسان کے لیے ''نو گو ایریا'' ہے۔ جب بھی انسان اس میں نقب لگانے کی جسارت کرتا ہے اوندھے منہ گرتا ہے۔ یہ خناس اکثر حکمرانوں کے ذہنوں میں جگہ بنا لیتا ہے کہ ہمچو ما دیگرے نیست! یہ دنیا جو معلوم کائنات کے سامنے ایسی حیثیت بھی نہیں رکھتی جیسے اس دنیا کے مقابلے میں کسی کاغذ پر قلم کی نوک سے لگائے ہوئے ایک نقطہ کی ہے، ایسی زمین کے کسی ایک ٹکڑے پر حکومت کرنے والا اور اس کے سیاہ وسفید کا خود کو مالک سمجھنے والا خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے اور ہمیشگی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے، حالانکہ وہ تو اپنی ذات کے حوالے سے بھی سیاہ وسفید کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے جسم کے بال اور ہاتھ پاؤں کے ناخن اس کی خواہش اور حکم کے تابع نہیں ہوتے، وہ کسی اور کو کیا تابع فرمان کرے گا؟ البتہ ایک دھوکہ ہے، ایک شیطنت ہے، جو اختیارات کی زیادتی اور وسائل کی کثرت سے انسانی ذہن میں جاگزیں ہوتی ہے۔ چونکہ موت جیسی اٹل حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، لہٰذا انسان اپنی اس نام نہاد خدائی کو اگلی نسل اور ذرّیت کو منتقل کر کے ہمیشگی کی خواہش کی تکمیل چاہتا ہے۔

انسانی تاریخ فرعونوں، نمرودوں سے بھری پڑی ہے، جنہوں نے محض انسان کو غلام بنانے اور وسائل پر کنٹرول کرنے کے بعد خود کو خدائی کا حقدار سمجھا، لیکن وہ نہ اشیاء کی حقیقت کو سمجھ سکے اور نہ ہی حقیقی خالق ومالک کی معرفت حاصل کر سکے۔ وہ یہ بھی نہ جان سکے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق اور مالک ہے، جبکہ انسان کسی ایک بھی شے کا خالق اور حقیقی اور ابدی مالک نہیں۔ انسان اللہ کی دی ہوئی عقل سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مختلف شکلیں اور رنگ دے سکتا ہے، خود کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ مثلاً انسان لکڑی سے میز یا کوئی دوسری شے بنا سکتا ہے، خود لکڑی پیدا نہیں کر سکتا۔ انسان کارخانے میں کپڑا بنا سکتا ہے، کپاس پیدا نہیں کر سکتا۔ انسان آگ کسی کارخانے میں تیار نہیں کر سکتا، وہ اسے پتھروں کے ٹکرانے یا کیمیکل کے ملانے سے یا رگڑنے سے پیدا کر سکتا ہے، اور یہ سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اسی طرح انسان اپنے جسم پر اوڑھے ہوئے کپڑوں کا بھی حقیقی اور ابدی مالک نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ انہیں یہ حکم نہیں دے سکتا کہ وہ گندے نہ ہوں یا پھٹنے نہ پائیں۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ایسا نہیں ہے کہ صرف غیر جمہوری معاشروں اور ممالک

(باقی صفحہ 95 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاَنْعام

آیات ۵۱ تا ۵۵

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ
وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ
بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ
شَىۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ
الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لِّيَقُوۡلُوۡۤا اَهٰٓؤُلَۤاءِ مَنَّ اللّٰهُ
عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا ؕ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ
يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ
مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡۤءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ
رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلِتَسۡتَبِيۡنَ سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۵۵﴾

ابھی پچھلے رکوع میں ہم نے پڑھا: ﴿وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ۚ﴾ (آیت ۴۸) کہ تمام رسول تبشیر اور اِنذار کے لیے آتے رہے۔ اور اسی سورت میں ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ حضورﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا: ﴿وَاُوۡحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ؕ﴾ (آیت ۱۹) ''یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے میں خبردار کروں تم لوگوں کو اور اُن تمام لوگوں کو بھی جن تک یہ پہنچے''۔ یہاں اب پھر قرآن کے ذریعے سے (بِہٖ) انذار کا حکم آ رہا ہے کہ (اے نبیﷺ) آپ کا کام انذار اور تبشیر ہے جسے آپ اس قرآن کے ذریعے سے سرانجام دیں۔

آیت ۵۱ ﴿وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ﴾ ''اور خبردار کر دیجیے اِس (قرآن) کے ذریعے سے اُن لوگوں کو جنہیں واقعتاً کچھ خوف ہے کہ وہ اپنے ربّ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے''

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے' مشرکینِ مکّہ میں بہت کم لوگ تھے جو بعث بعد الموت کے منکر تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگوں کا عقیدہ یہی تھا کہ مرنے کے بعد ہم اٹھائے جائیں گے' قیامت آئے گی اور اللہ کے حضور پیشی ہوگی' لیکن اپنے باطل معبودوں کے بارے میں اُن کا گمان تھا کہ وہ وہاں ہمارے چھڑانے کے لیے موجود ہوں گے اور ہمیں بچا لیں گے۔

﴿لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''اس حال میں کہ ان کے لیے نہیں ہوگا اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی سفارش کرنے والا' شاید کہ (اس طرح سمجھانے سے) ان میں کچھ تقویٰ پیدا ہو جائے۔''

ان کو خبردار کر دیں کہ اپنے باطل معبودوں اور ان کی شفاعت کے سہارے کے بارے میں اپنی غلط فہمیوں کو دور کر لیں۔ شاید کہ حقیقتِ حال کا ادراک ہونے کے بعد ان کے دلوں میں کچھ خوفِ خدا پیدا ہو جائے۔

آیت ۵۲ ﴿وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ﴾ ''اور مت دھتکاریے آپ ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح شام (اور) اس کی رضا کے طالب ہیں۔''

دراصل یہ اشارہ ہے اس معاملے کی طرف جو تقریباً تمام رسولوں کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر رسولوں کی دعوت پر سب سے پہلے مفلس اور نادار لوگ ہی لبیّک کہتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نبی کی محفل میں دیکھ کر صاحبِ ثروت وحیثیت لوگ اس دعوت سے اس لیے بھی بدکتے تھے کہ اگر ہم ایمان لائیں گے تو ہمیں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قرآن میں خصوصی طور پر ذکر ہوا ہے کہ آپؑ کی قوم کے سردار کہتے تھے کہ اے نوح ہم تو آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں' آپ کے پیغام کو سمجھنا چاہتے ہیں' لیکن ہم جب آپ کے اردگرد ان گھٹیا قسم کے لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہماری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ ہم ان کے ساتھ بیٹھیں۔ یہی بات قریش کے سرداران رسول

اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ آپؐ کے پاس ہر وقت جن لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے وہ لوگ ہمارے معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں' ان میں سے اکثر ہمارے غلام ہیں۔ ایسے لوگوں کی موجودگی میں آپ کی محفل میں بیٹھنا ہمارے شایانِ شان نہیں۔ ان کی ایسی باتوں کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی (ﷺ) آپ ان کی باتوں سے کوئی اثر نہ لیں' آپؐ خواہ مخواہ اپنے ان ساتھیوں کو خود سے دور نہ کریں۔ اگر وہ غریب ہیں یا ان کا تعلق پست طبقات سے ہے تو کیا ہوا' ان کی شان تو یہ ہے کہ وہ صبح شام اللہ کو پکارتے ہیں' اللہ سے مناجات کرتے ہیں' اُس کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں' اُس کے روئے انور کے طالب ہیں اور اُس کی رضا چاہتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ایسے لوگوں کے بارے میں ہی فرمایا گیا ہے: ﴿مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۲۰۷) کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں اور اپنی زندگیاں اللہ کی رضا جوئی کے لیے وقف کر دی ہیں۔

﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ''آپ کے ذمے ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں سے ان کے ذمے کچھ ہے''

یعنی ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خود جواب دہ ہے اور ہر شخص کو اپنی کمائی خود کرنی ہے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ آپ پر نہیں ہے۔ آپؐ کے ذمے آپ کا فرض ہے' وہ آپ ادا کرتے رہیں۔ جو لوگ آپ ﷺ کی دعوت پر ایمان لا رہے ہیں وہ بھی اللہ کی نظر میں ہیں اور جو اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں ان کا حساب بھی وہ لے لے گا۔ ہر ایک کو اُس کے طرزِ عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ نہ آپؐ ان کی طرف سے جواب دہ ہیں اور نہ وہ آپؐ کی طرف سے۔

﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝۵۲﴾ ''تو اگر (بالفرض) آپ انہیں اپنے سے دُور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔''

آیت ۵۳ ﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ ''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمایا ہے''

یہ اللہ کی آزمائش کا ایک طریقہ ہے۔ مثلاً ایک شخص مفلس اور نادار ہے' اگر وہ کسی

دولت مند اور صاحبِ منصب وحیثیت شخص کو حق کی دعوت دیتا ہے تو وہ اس پر حقارت بھری نظر ڈال کر مسکرائے گا کہ اس کو دیکھو اور اس کی اوقات کو دیکھو' یہ سمجھانے چلا ہے مجھ کو! حالانکہ اصولی طور پر اس صاحبِ حیثیت شخص کو غور کرنا چاہیے کہ جو بات اس سے کہی جا رہی ہے وہ صحیح ہے یا غلط' نہ کہ بات کہنے والے کے مرتبہ و منصب کو دیکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس طرح ہم لوگوں کی آزمائش کرتے ہیں۔

﴿لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝۵۳﴾ ''تاکہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے خاص انعام کیا ہے ہم میں سے؟ تو کیا اللہ زیادہ واقف نہیں ہے ان سے جو واقعتاً اس کا شکر کرنے والے ہیں؟''

صاحبِ حیثیت لوگ تو دعویٰ رکھتے ہیں کہ اللہ کا انعام اور احسان تو ہم پر ہوا ہے' دولت مند تو ہم ہیں' چودھراہٹیں تو ہماری ہیں۔ یہ جو گرے پڑے طبقات کے لوگ ہیں ان کو ہم پر فضیلت کیسے مل سکتی ہے؟ مکہ کے لوگ بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے اپنی کتاب نازل کرنی تھی' کسی کو نبوت دینی ہی تھی تو اس کے لیے کوئی ''رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ'' منتخب کیا جاتا۔ یعنی یہ مکہ اور طائف جو دو بڑے شہر ہیں ان میں بڑے بڑے سردار ہیں' سرمایہ دار ہیں' بڑی بڑی شخصیات ہیں' ان میں سے کسی کو نبوت ملتی تو کوئی بات بھی تھی۔ یہ کیا ہوا کہ مکہ کا ایک یتیم جس کا بچپن مفلسی میں گزرا ہے' جوانی مشقت میں کٹی ہے' جس کے پاس کوئی دولت ہے نہ کوئی منصب' وہ نبوت کا دعویدار بن گیا ہے۔ اس قسم کے اعتراضات کا ایک اور مسکت جواب اسی سورۃ کی آیت ۱۲۴ میں ان الفاظ میں آئے گا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ ''اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا منصب کس کو دینا چاہیے''۔ اور کس میں اس منصب کو سنبھالنے کی صلاحیت ہے۔ جیسے طالوت کے بارے میں لوگوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ کیسے بادشاہ بن سکتا ہے جبکہ اسے تو مال و دولت کی وسعت بھی نہیں دی گئی: ﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۴۷) ہم دولت مند ہیں' ہمارے مقابلے میں اس کی کوئی مالی حیثیت نہیں۔ اس کا جواب یوں دیا گیا کہ طالوت کو جسم اور علم کے اندر کشادگی ﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ عطا فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا اس میں بادشاہ بننے کی اہلیت تم لوگوں سے زیادہ ہے۔

یہاں رسول اللہ ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ ان غریب و نادار مؤمنین کے ساتھ آپ کا معاملہ کیسا ہونا چاہیے۔

آیت ۵۴ ﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ﴾ ”جب آپؐ کے پاس آئیں وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ ان سے کہیں کہ تم پر سلامتی ہو‘ تمہارے ربّ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے“

﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا ۢ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۴﴾ ”(اور تمہارے لیے اللہ کی خاص رحمت کا مظہر یہ ہے) کہ تم میں سے جو کوئی کسی بُرے کام کا ارتکاب کر بیٹھے گا جہالت کی بنا پر‘ پھر وہ اس کے بعد توبہ کرے گا اور اصلاح کرلے گا تو یقیناً اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔“

آیت ۵۵ ﴿وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۵۵﴾ ”اور اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل بیان کرتے ہیں تاکہ (لوگ ان پر غور وفکر کریں) اور مجرموں کا راستہ واضح ہوجائے۔“

یہاں پر ”نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ“ کے بعد ”لِيَتَفَكَّرُوْا بِهَا“ محذوف مانا جائے گا۔ یعنی ہم آیات کی تفصیل اس لیے بیان کرتے ہیں کہ لوگ ان پر غور وفکر کریں۔ اگر وہ ان پر غور کریں گے‘ تفکر کریں گے تو مجرموں کا راستہ ان کے سامنے کھل کر واضح ہوجائے گا۔

آیت ۵۶ تا ۶۰

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ
اَهْوَاۗءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْ عَلٰي بَيِّنَةٍ
مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۭ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ
يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ
لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ
الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ
اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

مُّبِيْنٍ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ
يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۶۰

آیت ۵۶ ﴿قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ”(اے نبیﷺ) کہہ دیجیے کہ مجھے تو منع کردیا گیا ہے ان کو پوجنے سے جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا۔“

یہ لات‘ منات‘ عزیٰ وغیرہ جن کو تم لوگ اللہ کے علاوہ معبود مانتے ہو‘ ان کو میں نہیں پکار سکتا۔ مجھے اس سے منع کردیا گیا ہے۔ مجھے تو حکم دیا گیا ہے: ﴿لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝۱۸﴾ (الجن) کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

﴿قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَاۗءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۵۶﴾ ”کہہ دیجیے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرسکتا‘ اگر ایسا کروں گا تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر نہ رہوں گا میں ہدایت پانے والوں میں۔“

آیت ۵۷ ﴿قُلْ اِنِّيْ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ﴾ ”کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے رب کی طرف سے ایک بڑی بَيِّنَه پر ہوں“

یہ بیّنہ ہے کیا؟ اس کی وضاحت سورۂ ھود میں آئے گی۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جاچکا ہے کہ ایک عام انسان کے لیے بیّنہ دو چیزوں سے مل کر بنتی ہے‘ انسان کی فطرتِ سلیمہ اور وحی الٰہی۔ فطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم انسان کے اندر اللہ کی طرف سے ودیعت کردی گئی ہے جس کی بنا پر اس کو نیکی بدی اور اچھے برے کی تمیز فطری طور پر مل گئی ہے۔ اس کے بعد اگر کسی انسان تک نبی یا رسول کے ذریعے سے اللہ کی وحی بھی پہنچ گئی اور اس وحی نے بھی اُن حقائق کی تصدیق کردی جن تک وہ اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم کی راہنمائی میں پہنچ چکا تھا‘ تو اس پر حجّت تمام ہوگئی۔ اس طرح یہ دونوں چیزیں یعنی فطرتِ سلیمہ اور وحی الٰہی مل کر اس شخص کے لیے بیّنہ بن گئیں۔ پھر اللہ کا رسول اور وحی الٰہی دونوں مل کر بھی لوگوں کے حق میں بیّنہ بن جاتے ہیں۔ خود رسولؐ کے حق میں بیّنہ یہ ہے کہ آپؐ اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقل سلیم کی راہنمائی میں جن حقائق تک پہنچ چکے تھے وحی الٰہی نے آکر ان حقائق کو اجاگر کردیا۔ چنانچہ حضورﷺ سے کہلوایا جارہا

ہے کہ آپ ان کو بتائیں کہ میں کوئی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا' میں تو اپنے ربّ کی طرف سے بیّنہ پر ہوں۔ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ بہت واضح اور روشن راستہ ہے' اور مجھ پر اس کی باطنی حقیقت بھی منکشف ہے۔

﴿وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ﴾ ''اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ میرے پاس وہ شے موجود نہیں ہے جس کی تم جلدی مچا رہے ہو۔''

وہ لوگ جلدی مچا رہے تھے کہ لے آیئے ہمارے اوپر عذاب۔ دس برس سے آپ ہمیں عذاب کی دھمکیاں دے رہے ہیں' اب جب کہ ہم نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا ہے تو وہ عذاب ہم پر آ کیوں نہیں جاتا؟ جواب میں حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ انہیں صاف الفاظ میں بتا دیں کہ عذاب کا فیصلہ میرے اختیار میں نہیں ہے' وہ عذاب جب آئے گا' جیسا آئے گا' اللہ کے فیصلے سے آئے گا اور جب وہ چاہے گا ضرور آئے گا۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ ﴿٥٧﴾﴾ ''فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں سوائے اللہ کے۔ وہ حق کو کھول کر بیان کر دیتا ہے اور وہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔''

آیت ۵۸ ﴿قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٨﴾﴾ ''کہہ دیجیے اگر میرے پاس وہ ہوتا جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان (کبھی کا) فیصلہ طے ہو چکا ہوتا' اور اللہ خوب واقف ہے ظالموں سے۔''

ان الفاظ سے ایک حد تک تلخی اور بیزاری ظاہر ہو رہی ہے کہ اگر یہ فیصلہ کرنا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں مزید مہلت نہ دیتا۔ اب میں بھی تمہارے رویّے سے تنگ آ چکا ہوں' میرے بھی صبر کا پیمانہ آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔

آیت ۵۹ ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ﴾ ''اور اُسی کے پاس غیب کے سارے خزانے ہیں' کوئی نہیں جانتا اُن (خزانوں) کو سوائے اُس کے' اور وہ جانتا ہے جو کچھ ہے خشکی میں اور سمندر میں۔''

﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا﴾ ''اور نہیں گرتا کوئی ایک پتا بھی (کسی درخت سے) مگر وہ اُس کے علم میں ہوتا ہے''

﴿وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٩﴾﴾ ''اور نہیں (گرتا) کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں' اور نہ کوئی تر و تازہ اور نہ کوئی سوکھی چیز' مگر ایک کتابِ مبین میں (سب کی سب) موجود ہیں۔''

یہ کتاب مبین اللہ کا علم قدیم ہے' جس میں ہر شے (مَا كَانَ وَ مَا يَكُوْن) آنِ واحد کی طرح موجود ہے۔

آیت ۶۰ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ﴾ ''اور وہی ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے رات کے وقت''

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۵ کی تشریح کے سلسلے میں يُوَفِّيْ' يَتَوَفّٰى اور مُتَوَفِّيْ وغیرہ الفاظ کی وضاحت ہو چکی ہے' جس سے قادیانیوں کی ساری خباثت کا توڑ ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کیجیے! یہاں وفات دینے کے کیا معنی ہیں؟ کیا نیند کے دوران انسان مر جاتا ہے؟ نہیں' جان تو بدن میں رہتی ہے' البتہ شعور نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں تین چیزیں الگ الگ ہیں' جسم' جان اور شعور۔ فارسی کا ایک بڑا خوبصورت شعر ہے ؎

جاں نہاں در جسم' اُو در جاں نہاں　　　اے نہاں' اندر نہاں' اے جانِ جاں!

''جان جسم کے اندر پنہاں ہے اور جان میں وہ پنہاں ہے۔ اے کہ جو پنہاں شے کے اندر پنہاں ہے' تو ہی تو جانِ جاں ہے!''

اس شعر میں ''اُو'' (وہ) سے مراد کچھ اور ہے' جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت صرف یہ سمجھ لیجیے کہ ان تین چیزوں (یعنی جسم' جان اور شعور) میں سے نیند میں صرف شعور جاتا ہے جبکہ موت میں شعور بھی جاتا ہے اور جان بھی چلی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ''تَوَفِّيْ'' مکمل صورت میں وقوع پذیر ہوا تھا' یعنی جسم' جان اور شعور تینوں چیزوں کے ساتھ۔ عام آدمی کی موت کی صورت میں یہ ''تَوَفِّيْ'' ادھورا ہوتا ہے' یعنی جسم یہیں رہ جاتا ہے' جان اور شعور چلے جاتے ہیں' جب کہ نیند کی حالت میں صرف شعور جاتا ہے۔

﴿وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ﴾ ''اور وہ

جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو دن کے وقت' پھر وہ اس میں (اگلی صبح کو) تمہیں اُٹھاتا ہے' تا کہ (تمہاری) مدّتِ معیّن پوری ہو جائے۔''

یعنی روزانہ ہم ایک طرح سے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں' کیونکہ نیند آدھی موت ہوتی ہے۔ جیسے صبح کے وقت اٹھنے کی مسنون دعا میں مذکور ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرِ (کُل شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے دوبارہ زندہ کیا' اس کے بعد کہ مجھ پر موت وارد کر دی تھی اور اُسی کی طرف جی اُٹھنا ہے)۔ اس دعا سے ایک بڑا عجیب نکتہ ذہن میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی جس شخص کی زبان پر یہ الفاظ آتے ہوں: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرِ'' قیامت کے دن جب وہ قبر سے اٹھے گا تو دنیا میں اپنی عادت کے سبب اُس کی زبان پر خود بخود یہی ترانہ جاری ہو جائے گا' جو اُس وقت لفظی اعتبار سے صد فی صد درست ہو گا' کیونکہ وہ اٹھنا حقیقی موت کے بعد کا اٹھنا ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ زندگی میں روزانہ اس کی ریہرسل کی جائے تا کہ یہ عادت پختہ ہو جائے۔

﴿ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٦٠﴾ ''پھر اُسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے' پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔''

آیت ٦١ تا ٧٠

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰۗی اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝٦١ ثُمَّ رُدُّوْۗا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ۝٦٢ قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝٦٣ قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝٦٤ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۗی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ

اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ ۝٦٥ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ۝٦٦ۭ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٦٧ وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۗ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ۭ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝٦٨ وَمَا عَلَى الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝٦٩ وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝٧٠ۧ

آیت ٦١ ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ۭ﴾ ''اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی مشیّت سے انسان کو اپنی اجل مُعیّن تک بہر صورت زندہ رہنا ہے' اس لیے ہر انسان کے ساتھ اللہ کے مقرّر کردہ فرشتے اس کے باڈی گارڈز کی حیثیت سے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ کبھی انسان کو ایسا حادثہ بھی پیش آتا ہے جب زندہ بچ جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہوتا' لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے ہاتھ دے کر اسے بچا لیا ہو۔ بہر حال جب تک انسان کی موت کا وقت نہیں آتا' یہ محافظ اُس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

﴿حَتّٰۗی اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝٦١﴾ ''یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کو قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔''

اب یہاں پھر لفظ تَوَفّٰی شعور اور جان دونوں کے جانے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرّر کردہ فرشتے جان نکالنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ انہیں جو حکم دیا جاتا

ہے‘ جب دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

آیت ۶۲ ﴿ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾ ’’پھر وہ لوٹا دیے جاتے ہیں اللہ کی طرف جو اُن کا مولیٰ ہے برحق۔‘‘

﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝۶۲﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ فیصلے کا اختیار اُسی کے ہاتھ میں ہے‘ اور وہ حساب کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر تیز ہے۔‘‘

حقیقی حاکمیت صرف اللہ ہی کی ہے۔ یہ بات یہاں دوسری دفعہ آئی ہے۔ اس سے پہلے آیت ۵۷ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ کہ فیصلے کا اختیار کلیتاً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مزید فرمایا کہ وہ سب سے زیادہ تیز حساب چکانے والا ہے۔ اُسے حساب چکانے میں کچھ دیر نہیں لگے گی‘ صرف حرفِ کُن کہنے سے آنِ واحد میں وہ سب کچھ ہو جائے گا جو وہ چاہے گا۔

آیت ۶۳ ﴿قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ﴾

’’ان سے پوچھئے کون تمہیں نجات دیتا ہے خشکی اور سمندروں کے اندھیروں سے جبکہ تم اُسی کو پکارتے ہو بہت ہی گڑگڑاتے ہوئے اور (دل ہی دل میں) چپکے چپکے۔‘‘

کبھی تم نے غور کیا کہ جب تم سمندر میں سفر کرتے ہو‘ وہاں گھپ اندھیرے میں جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور سمندر کی خوفناک طوفانی لہریں ہر لحظہ موت کا پیغام دے رہی ہوتی ہیں تو ایسے میں اللہ کے سوا تمہیں کون بچاتا ہے؟ کون ہے جو تمہاری دستگیری کرتا ہے اور تمہارے لیے عافیت کا راستہ نکالتا ہے۔ اسی طرح ؏ ’’اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو!‘‘ کے مصداق جب کوئی قافلہ صحرا میں بھٹک جاتا ہے‘ اندھیری رات میں نہ دائیں کا پتا ہوتا ہے نہ بائیں کی خبر‘ ہر درخت اندھیرے میں ایک آسیب معلوم ہوتا ہے‘ ایسے خوفناک ماحول اور انتہائی مایوسی کے عالم میں سب خداؤں کو بھلا کر تم لوگ ایک اللہ ہی کو پکارتے ہو۔

﴿لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۶۳﴾ ’’(اور کہتے ہو) اگر اللہ نے ہمیں اس سے بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار بن کر رہیں گے۔‘‘

آیت ۶۴ ﴿قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝۶۴﴾

’’کہیے اللہ ہی نجات دیتا ہے تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے‘ پھر تم شرک کرنے

لگتے ہو!‘‘

مصیبت سے نجات کے بعد پھر سے تمہیں دیویاں‘ دیوتا‘ جھوٹے معبود اور اپنے سردار یاد آ جاتے ہیں۔ اب اگلی آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں عذابِ الٰہی کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔

آیت ۶۵ ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ ’’کہہ دیجیے کہ وہ قادر ہے اس پر کہ تم پر بھیج دے کوئی عذاب تمہارے اوپر سے‘‘

مثلاً آسمان کا کوئی ٹکڑا یا کوئی شہابِ ثاقب (meteorite) گر جائے۔ آج کل ایسی خبریں اکثر سننے کو ملتی ہیں کہ اس طرح کی کوئی چیز زمین پر گرنے والی ہے‘ لیکن پھر اللہ کے حکم سے وہ خلا میں ہی تحلیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ozone کی تہہ بھی اللہ تعالیٰ نے زمین اور زمین والوں کے بچاؤ کے لیے پیدا کی ہے‘ وہ چاہے تو اس حفاظتی چھتری کو ہٹا دے۔ بہرحال آسمانوں سے عذاب نازل ہونے کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے اور اللہ جب چاہے یہ عذاب نازل ہو سکتا ہے۔

﴿اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ ’’یا تمہارے قدموں کے نیچے سے‘‘

یہ عذاب تمہارے قدموں کے نیچے سے بھی آ سکتا ہے‘ زمین پھٹ سکتی ہے‘ زلزلے کے باعث شہروں کے شہر زمین میں دھنس سکتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے پہلے تین بڑے بڑے ’’خسف‘‘ ہوں گے‘ یعنی زمین وسیع پیمانے پر تین مختلف جگہوں سے دھنس جائے گی۔ عذاب کی دو شکلیں تو یہ ہیں‘ اُوپر سے یا قدموں کے نیچے سے۔

﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ ’’یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور ایک کی طاقت کا مزا دوسرے کو چکھائے۔‘‘

یہ خانہ جنگی کی صورت میں عذاب کا ذکر ہے کہ کسی ملک کے عوام یا قوم کے مختلف گروہ آپس میں لڑ پڑیں۔ جیسے پنجابی اور اردو بولنے والے آپس میں الجھ جائیں‘ بلوچ اور پختون ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں‘ شیعہ سُنّی کو مارے اور سُنّی شیعہ کو۔ اللہ تعالیٰ کو آسمان سے کچھ گرانے کی ضرورت ہے نہ زمین کو دھنسانے کی۔ یہ گروہ بندی اور اس کی بنیاد پر باہمی خون ریزی عذابِ الٰہی کی بدترین شکل ہے‘ جو آج مسلمانانِ پاکستان پر مسلّط ہے۔ تقسیم

ہند سے قبل جب ہندو سے مقابلہ تھا تو مسلمان ایک قوم تھے۔ پاکستان بنا تو اُس کے تمام باسی پاکستانی تھے۔ اب یہی پاکستانی قوم چھوٹی چھوٹی قومیتوں اور عصبیتوں میں تحلیل ہو چکی ہے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہے۔

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾ ''دیکھو کس کس طرح ہم اپنی آیات کی تصریف کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔''

تصریف کے معنی ہیں گھمانا۔ ع ''اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کے مصداق ایک ہی بات کو اسلوب بدل بدل کر مختلف انداز میں نئی نئی ترتیب کے ساتھ بیان کرنا۔

آیت ۶۶ ﴿وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) آپ کی قوم نے اسے جھٹلا دیا حالانکہ وہ حق ہے۔''

یہاں بِہٖ سے مراد قرآن ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' اس سورۃ کا عمود یہ مضمون ہے کہ مشرکین کے مطالبے پر کوئی حسی معجزہ نہیں دکھایا جائے گا' محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ یہ قرآن ہے۔ اسی لیے اس مضمون کی تفصیل میں 'بِہٖ' کی تکرار کثرت سے ملے گی۔

﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾﴾ ''(ان سے) کہہ دیجیے کہ (اب) میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں۔''

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ کب اللہ کے عذاب کا دروازہ کھل جائے اور عذابِ ہلاکت تم پر ٹوٹ پڑے۔

آیت ۶۷ ﴿لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾﴾ ''ہر بڑی بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے' اور عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

جیسا کہ سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٩﴾﴾ ''میں یہ تو نہیں جانتا کہ جس عذاب کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ قریب آ چکا ہے یا دُور ہے''۔ البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر تمہاری روش یہی رہی تو یہ عذاب تم پر ضرور آ کر رہے گا۔

اب وہ آیت آ رہی ہے جس کا حوالہ سورۃ النساء کی آیت ۱۴۰ میں آیا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ تم پر کتاب میں یہ بات نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان کے پاس مت بیٹھو.....'' ایمان کا کم از کم تقاضا ہے کہ ایسی محفل

سے احتجاج کے طور پر واک آؤٹ تو ضرور کیا جائے۔

آیت ۶۸ ﴿وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ ''اور جب تم دیکھو لوگوں کو کہ وہ ہماری آیات میں مین میخ نکال رہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ''

اردو میں ''غور و خوض'' کی ترکیب کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ ''غور'' اور ''خوض'' دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں اور معانی کے اعتبار سے دونوں کی آپس میں مشابہت ہے۔ 'غور' مثبت انداز میں کسی چیز کی تحقیق کرنے کے لیے بولا جاتا ہے جب کہ 'خوض' منفی طور پر کسی معاملے کی چھان بین کرنے اور خواہ مخواہ بال کی کھال اتارنے کے معنی دیتا ہے۔

﴿حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں۔''

جب کسی محفل میں لوگ اللہ اور اس کی آیات کا تمسخر اڑا رہے ہوں تو ان سے کنارہ کشی کر لو اور جب وہ کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے لگیں تو پھر تم ان کے پاس جا سکتے ہو۔

﴿وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٨﴾﴾
''اور اگر تمہیں شیطان بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔''

یعنی کسی محفل میں گفتگو شروع ہوئی اور کچھ دیر تک تمہیں احساس نہیں ہوا کہ یہ لوگ کس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں' لیکن جونہی احساس ہو جائے کہ ان کی گفتگو اور اندازِ گفتگو قابلِ اعتراض ہے تو احتجاج کرتے ہوئے فوراً وہاں سے واک آؤٹ کر جاؤ۔ اب چونکہ دعوت و تبلیغ کے لیے تمہارا ان کے پاس جانا ایک ضرورت ہے لہٰذا ایسی محفلوں کے بارے میں کسی بہتر صورتِ حال کے منتظر رہو' اور جب ان لوگوں کا رویہ مثبت ہو تو ان کے پاس دوبارہ جانے میں کوئی حرج نہیں۔ یعنی وہی ''قَالُوْا سَلٰمًا'' والا انداز ہونا چاہیے کہ علیحدہ بھی ہوں تو لٹھ مار کر نہ ہو جائے بلکہ چپکے سے' متانت کے ساتھ کنارہ کر لیا جائے۔

آیت ۶۹ ﴿وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾﴾ ''اور یقیناً جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے' لیکن یہ یاد دہانی ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔''

آیت ۷۰ ﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا﴾ ''اور چھوڑ دو ان لوگوں کو

جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا ہے‘‘

آج بھی ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دین کے معاملے میں کبھی سنجیدہ ہوتے ہی نہیں۔ وہ دین کی ہر بات کو استہزا اور تمسخر میں اڑانے کے عادی ہوتے ہیں۔

﴿وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ ’’اور ان کو دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے دنیا کی زندگی نے‘‘

ان کی ساری توجہ‘ تمام بھاگ دوڑ دنیا کے لیے ہے۔ زیادہ سے زیادہ کمانا‘ مال جمع کرنا اور جائیدادیں بنانا ہی ان کا مقصدِ حیات ہے‘ خواہ حلال سے ہو یا حرام سے‘ اس کی کوئی پروا ان کو نہیں ہوتی۔

﴿وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ﴾ ’’اور آپ تذکیر کیجیے اسی (قرآن) کے ذریعے سے‘ مبادا کوئی جان اپنے کرتوتوں کے سبب گرفتار ہو جائے۔‘‘

سورۂ قٓ کی آخری آیت میں حکم دیا گیا ہے: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝۴۵﴾ کہ آپ قرآن کے ذریعے سے تذکیر کیجیے اُس شخص کو جس کے اندر اللہ کی وعید کا کچھ خوف ہے۔ اسی طرح یہاں بھی حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان دنیا کے پرستاروں کو چھوڑیئے‘ البتہ اس قرآن کے ذریعے سے انہیں تذکیر کرتے رہیے‘ انہیں یاد دہانی کراتے رہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اپنے کرتوتوں اور بداعمالیوں کے وبال میں گرفتار ہو جائے۔

﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ﴾ ’’پھر اُس کے لیے نہیں ہو گا اللہ کے مقابلے میں کوئی کارساز اور نہ کوئی سفارشی۔‘‘

شفاعت کے بارے میں دوٹوک انکار (categorical denial) یہاں دوسری دفعہ آیا ہے۔ اس سے پہلے آیت ۵۱ میں بھی یہ مضمون آ چکا ہے۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۵۴) میں ﴿يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ کے دوٹوک الفاظ کے بعد اگلی آیت (آیت الکرسی) میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ چنانچہ شفاعتِ حقہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شفاعت کی کچھ شرائط اور کچھ حدود (limits) ہیں۔ ان شرائط اور حدود و قیود کے بغیر مطلق شفاعت کا تصور

گویا ایمان بالآخرت کی نفی کے مترادف ہے۔ یعنی جب آپ کو چھڑانے والے موجود ہیں تو پھر ڈر کاہے کا؟ جو چاہو کرو! شرابی ہیں‘ زانی ہیں‘ چور ہیں‘ ڈاکو ہیں‘ حرام خور ہیں‘ غبن کرتے ہیں‘ جو بھی کچھ ہیں‘ لیکن اے اللہ تیرے محبوب ﷺ کی اُمت میں ہیں! تو اگر اسی طرح سے کوئی معاملہ طے ہونا ہے تو خواہ مخواہ کا ہے کو کوئی اپنا ہاتھ روکے‘ جی بھر کر عیش کیوں نہ کرے؟ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

﴿وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا﴾ ’’اور اگر وہ فدیہ دینا چاہے کُل کا کُل فدیہ تو بھی اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔‘‘

یہ مضمون بھی سورۃ البقرۃ میں دو مرتبہ (آیت ۴۸ و ۱۲۳) آ چکا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۷۰﴾ ’’یہی لوگ ہیں جو گرفتار ہو چکے ہیں اپنے کرتوتوں کی پاداش میں۔ ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہو گا ان کے کفر کی پاداش میں۔‘‘

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Visit us at www.tanzeem.org

قانونِ تحفّظِ ناموسِ رسالت

اعتراضات اور جوابات

جنابِ خرم مرادؒ کی ایک یادگار تحریر

۱۹۹۳ء میں گوجرانوالہ کی سیشن کورٹ نے دو غیر مسلموں کو توہینِ رسالت ﷺ کے جرم میں سزائے موت سنائی۔ اُس وقت بھی مغربی سفارت کار اور ذرائع ابلاغ اس فیصلہ کے خلاف حرکت میں آ گئے اور اُن کے دیسی ایجنٹوں نے قانونِ تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کی تنسیخ کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس موقع پر مدیر ''ترجمان القرآن'' جناب خرام مرادؒ نے ایک ایمان افروز تحریر کے ذریعہ ناموسِ رسالت کے خلاف اٹھنے والے فتنہ کا جواب دیا تھا' جس میں مسئلے کے تمام پہلوؤں کا بڑے مدلل انداز میں اور کمالِ عدل کے ساتھ احاطہ کیا گیا تھا۔ یہ تحریر آج بھی ناموسِ رسالت ﷺ کے خلاف اٹھائے گئے فتنہ کے خلاف انتہائی مؤثر افادیت کی حامل ہے۔

توہینِ رسالت ﷺ کا حالیہ مقدمہ' معمول کے مطابق محض جرم وسزا کا ایک مقدمہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ اگر دونوں ملزم بے گناہ تھے' یا ان پر جرم شرعی معیارِ شہادت کے مطابق ثابت نہ ہو سکا تھا' یا اس میں کوئی ادنیٰ سا بھی شبہ تھا' تو حق وانصاف کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو بری کر دیا جاتا۔ اس حق وانصاف اور رحم ودرگزر کا' جس کی تعلیم ہمیں اسی نبی کریم ﷺ نے دی ہے' جس کی توہین کا مقدمہ تھا' جس نے بدترین دشمن کے ساتھ بھی عدل ورحم کا برتاؤ کیا ہے' اور ہر قیمت پر عدل کرنے کا حکم دیا ہے' اور یہ تو ہمارے معاہد اور برابر کے شہری تھے' مگر پورے مقدمے کے دوران جس طرح اور جس پیمانے پر طاقتور بیرونی اور اندرونی قوتیں اثر انداز ہوتی رہیں' اس نے مذکورہ مقدمے کو ایک غیر معمولی نوعیّت دے دی ہے۔ اس نے توہینِ رسالت ﷺ کے معاملے کو ہمارے مقدر کا' ہمارے حال اور مستقبل کا ایک آئینہ بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ملزمان کی براءت بھی مشتبہ ہو گئی ہے' جو یقیناً ان کے ساتھ ایک بے انصافی ہوئی ہے۔

اس آئینے میں وہ ساری کھلی اور چھپی صورتیں بالکل بے نقاب ہو گئی ہیں' جو آج ہمارے مستقبل کی نقشہ گری اور ہمارے مقدر کے بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔

ان صورتوں میں' اندرونی بھی ہیں اور بیرونی بھی' تہذیبی بھی ہیں اور سیاسی بھی' فکری بھی ہیں اور ابلاغی بھی۔ اس آئینے میں ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری بربادی کے مشورے کہاں ہو رہے ہیں' جنگ کا نقشہ کیا ہے' محاذ کہاں کہاں کھولے جا رہے ہیں' مورچے کہاں کہاں بنائے گئے ہیں' چالیں کیا کیا چلی جا رہی ہیں' دور مار توپیں کدھر کدھر سے گولہ باری کر رہی ہیں' ہتھیار کون کون سے استعمال ہو رہے ہیں' پیش قدمی کن کن راستوں سے ہو رہی ہے' اندر کون کون ایجنٹ بنے ہوئے ہیں' عزائم کیا ہیں اور اصل ہدف کیا ہے؟ —— اور یہ بھی کہ —— ہماری قوت کا اصل راز کیا ہے' ہم بازی کیسے پلٹ سکتے ہیں' بلکہ جیت سکتے ہیں۔

● ایک چہرہ مغرب کا ہے' اس کے حکمرانوں' اہل کاروں اور سفارت کاروں اور ذرائع ابلاغ کے سحر کاروں کا چہرہ' جو پورے مقدمے کے دوران تیز تیز چلتے' بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے رہے۔ یہ چہرہ اب کچھ ایسا ڈھکا چھپا بھی نہیں رہا۔ ذرا موقع نکلتا ہے' فوراً اوپر سے تہذیب' روشن خیالی اور انسانی ہمدردی کا چھلکا اتر جاتا ہے' اور نیچے سے وہی مسلمان اور اسلام کی دشمنی کا چودہ سو سال پرانا رویہ اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف نفرت اور غصہ ٹپکتا ہوا چہرہ نمودار ہو جاتا ہے۔

سیکولرازم اور انسانی حقوق کی علم بردار ریاستیں بالآخر محض عیسائی ریاستیں ثابت ہوتی ہیں' جو ہر ملک کے ملکی قوانین کے خلاف عیسائی حقوق کے لیے سرگرم ہو جاتی ہیں۔ فلسطین ہو یا بوسنیا' کشمیر ہو یا چیچنیا' الجیریا ہو یا فرانس —— چہرہ روشن' اندرون چنگیز (ہزاروں انسانوں کا قاتل تاتار حکمران) سے تاریک تر۔ مغرب کی یہ قوتیں ہمارے ہاں تہذیبی اور سیاسی غلبہ رکھتی ہیں' ہماری قسمت کے ساتھ کھیل رہی ہیں' یہاں تک کہ اب ہمارا ایک قانون اور ہمارے دو شہریوں کے خلاف ہماری عدالت میں ایک مقدمہ بھی ان کے غلبے سے آزاد نہیں۔

● ایک چہرہ مغرب کے فرزندوں کا ہے' جو برطانوی مؤرخ لارڈ [تھامس بابنگٹن] میکالے [م:۱۸۵۹ء] کے خواب کی مکمل تعبیر ہے: ''خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہم میں سے نہیں' مگر مذاق اور رائے' الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز''۔ یا لبنانی ادیب خلیل جبران [م:۱۹۳۱ء] کے الفاظ میں: ''جن کے جسم خواہ یہاں پیدا ہوئے ہوں' مگر ان کی روحوں نے

مغربی ہسپتالوں میں جنم لیا ہے۔ جو فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں' مگر ہمارے [فرنگی سامراجیوں کے] سامنے کمزور اور گونگے ہیں۔ جو آزادی کے علم بردار ہیں' مصلح ہیں' پرجوش ہیں' مگر اپنے اسٹیجوں پر' اہلِ مغرب کے سامنے اطاعت کیش اور رجعت پسند ہیں'——— یہ فرزندانِ مغرب' توہین رسالتؐ جیسے معاملات میں ایک سو ایک فی صد مغرب کے ہم نوا رہتے ہیں' مغرب سے بڑھ کر پیش پیش ہوتے ہیں۔

● ایک چہرہ ان کا ہے' جو کسی طرح بھی لارڈ میکالے کے خواب کی مکمل تعبیر نہ بن سکے' وہ اسلام اور ملت سے اپنا رشتہ کھرچ نہیں سکے' لیکن اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی درجے میں فرنگی افکار کے جادو میں گرفتار ہیں۔ ان کے مزاج کے لیے بھی یہ قبول کرنا مشکل ہے کہ توہینِ رسالتؐ کی سزا موت ہو۔

وہ پوچھتے ہیں: کیا یہ سخت سزا قرآن سے ثابت ہے؟ کہیں یہ ملا کی تنگ نظری اور شدت کا شاخسانہ تو نہیں؟ جو رحمۃ للعالمین ﷺ تھے اور جنہوں نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں' ان کی توہین پر ایسی سخت سزا......! دنیا ہمارے بارے میں کیا کہے گی' ہمیں کیا سمجھے گی' ہم اسے کیا منہ دکھائیں گے؟

خودنگری اور مستقبل بینی کا یہ آئینہ ہمارے ہاتھوں میں اگر مسئلۂ توہین رسالتؐ کے ذریعے آیا' تو بالکل بجا آیا:

قوم را سرمایۂ قوّت ازو   حفظِ سِرّ وحدتِ مِلّت ازو

''ما ز حکمِ نسبتِ او ملّتیم'': آں حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک ہی ہماری قوت کا سرمایہ ہے' ہماری وحدت کا راز آپؐ سے وابستگی میں ہے' آپؐ سے نسبت ہی نے ہمیں ایک ملّت بنایا ہے' بلکہ ہمارے جسد ملی میں رسالت ہی کی جان پھونکی گئی ہے' اسی کے دم سے ہمارا دین ہے' ہمارا آئین ہے:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید   وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما   از رسالت دینِ ما آئینِ ما

مغرب کا اضطراب اور شور و غوغا قابل فہم ہے۔ اس لیے نہیں' جیسا بعض لوگ [گستاخیِ رسولؐ کے مرتکب] سلمان رشدی کی یاوہ گوئی کے وقت سے کہہ رہے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک رسول ﷺ کا مقام کیا ہے' اور کیوں ہے؟ مغرب سے ہماری

مراد سارے اہل مغرب نہیں' تاہم ان میں سے اکثر کے بارے میں یہ بات صحیح ہے' اور مغرب کے طلسم میں گرفتار سادہ دل مسلمانوں کے بارے میں بھی۔ یقیناً ان سب کو سمجھانے کی ضرورت ہے' ان کو سمجھا لینے ہی میں ہماری کامیابی پوشیدہ ہے۔ مگر جو حکمران' سفارت کار' دانش ور اور ذرائع ابلاغ کے سحر کار قانونِ توہین رسالت ﷺ کے خلاف پیش پیش ہیں' وہ اسی لیے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان ملت کی زندگی' وحدت اور قوت و توانائی کا راز اور ان کی سربلندی کا راز بھی حضور ﷺ کے ساتھ وابستگی اور عشق و محبت میں پوشیدہ ہے ع ''دردلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است''۔

اسی لیے ہزار سال سے اوپر مدت ہوگئی' ان کے نقش جنگ کا ہدف یہی مقامِ مصطفی ﷺ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کا یہی قلب اور دارالحکومت ہے۔ اس کی شکست و ریخت' بربادی اور اس پر قبضہ کے بغیر اس ملت کو زیر کرنے کا اور کوئی نسخہ نہیں۔ اسی لیے آں حضور ﷺ کی ذات ان کے سارے حملوں کا اوّلین ہدف رہی ہے' اور ہے۔ اسی لیے وہ مسلسل ہر قسم کے انتہائی غلیظ وار' آپ ﷺ کے خلاف کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے سلمان رشدی ان کی آنکھوں کا تارا ہے' یورپ کی حکومتوں کے سفارتی تعلقات اور تجارتی مفادات اس کے خلاف فتویٰ کے محور پر گھوم رہے ہیں۔ اسی لیے تسلیمہ نسرین ان کی ہیروئن ہے۔ اسی لیے ہر وہ مسلمان جو: شریعتِ مصطفوی ﷺ کو بے وقعت کرے' جو تعلیماتِ محمدی ﷺ کو مشکوک بنائے' جو مقامِ مصطفوی ﷺ کو مجروح کرے' وہ انہیں محبوب ہے۔ اور یہ حکیمانِ مغرب کا فتویٰ ہے:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!

اسی لیے مذکورہ دو افراد کے خلاف مقدمہ دائر ہوتے ہی غیر مسلم دنیا کے ذرائع ابلاغ اور سفارت کار حرکت میں آگئے اور یہ واقعہ عالمی شہرت کا حامل بن گیا۔ ان سب کا ہدف ملزموں کی بے گناہی ثابت کرنا نہیں' بلکہ توہین رسالت ﷺ کے قانون کی تنسیخ رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو' بی بی سی' وائس آف امریکا' وائس آف جرمنی کی نشریات' اخبارات' رسائل و جرائد میں مضامین اور خبروں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ انہی بیرونی لابیوں کے ساتھ پاکستان ہیومن رائٹس کمیشن بھی متحرک ہوگیا۔

امریکہ میں پاکستانی سفیر' ملیحہ لودھی' گوجرانوالہ گئیں اور ملزموں کی ضمانت کے لیے

عدالت پر زور ڈالا۔ امریکی نائب وزیر خارجہ رابن رافیل ۱۹۹۳ء میں اسلام آباد آئیں' تو وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے دوران اس کیس کو اٹھایا۔ پاکستانی سیکرٹری خارجہ نے انہیں یقین دلایا کہ "ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے گا"۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اس مقدمے میں ذاتی دلچسپی لی' اور جب مجرموں کو سزا ہوئی تو انہیں سخت دکھ ہوا۔ اپریل ۱۹۹۴ء میں پاکستان کی وفاقی کابینہ نے موصوفہ کی صدارت میں توہینِ رسالت ﷺ کے مرتکب فرد کے لیے موت کی سزا کو دس سال قید کی سزا میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔

پھر جب ملزموں کو سیشن کورٹ سے سزا ہوئی تو سارے بین الاقوامی' سفارتی اور ابلاغی ذرائع نے نفرت انگیز پروپیگنڈے کے ذریعے پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈالنے کی مہم تیز کر دی۔ برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر' ملزمان سے ملاقات کے لیے جیل پہنچ گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک بنچ نے' جو عارضی [ایڈہاک] ججوں پر مشتمل تھا' مسلسل روزانہ اپیل کی سماعت شروع کر دی۔ بالآخر ملزمان رہا ہو گئے اور راتوں رات ان کو جرمنی روانہ کر دیا گیا۔

عدالتوں کے فیصلے تسلیم کیے بغیر کوئی مہذب اور پُرامن معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ہائی کورٹ نے صحیح فیصلہ ہی کیا ہو گا۔ لیکن' اس مسلسل بین الاقوامی اور حکومتی دباؤ اور عدالتی کارروائی میں حیرت انگیز سرعت نے پورے فیصلے کو مشکوک بنا دیا۔ اس دباؤ کے آگے اس دباؤ کی کیا حیثیت اور کیا وزن' جو عدالتی کاروائی کے دوران اور فیصلے کے بعد عوام نے لاہور کی سڑکوں پر نکل کر ڈالا۔ ہر تجزیہ نگار' پوراپس منظر جان بوجھ کر نظر انداز کر کے' سارا زور عوامی احتجاج کی مذمت کرنے میں لگا رہا۔ ہم بھی کسی عدالت پر اس طرح عوامی دباؤ ڈالنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دوسری طرف سے وہ لوگ زبردست دباؤ ڈال رہے تھے' جن کی مٹھی میں حکمرانوں کے اقتدار کی کنجی ہے' ڈالر ہیں' دہشت گرد قرار دینے کی لاٹھی ہے اور "مہذب" بھی کہلاتے ہیں۔

تہذیب کے دعووں کے ساتھ اب مغرب کے لیے قرونِ وسطیٰ کی طرح دشنام طرازیاں تو ممکن نہیں' البتہ ان کی جگہ آج کے رائج الفاظ کے پردے میں توہین رسالتؐ کے قانون پر حملہ ہو رہا ہے: "یہ قانون' انسانی اور بنیادی حقوق کے خلاف ہے' مذہبی آزادی کے خلاف ہے' اظہارِ رائے کی آزادی کے خلاف ہے' اقلیتوں کے خلاف تعصب اور امتیاز پر مبنی ہے' اقلیتی فرقوں کے سر پر ننگی تلوار لٹکا دی گئی ہے' فرقہ واریت اور ذاتی عناد کی بنا پر اس قانون کا غلط

استعمال ہو رہا ہے' اس سے مُلّا' بنیاد پرستی' مذہبی جنون اور تنگ نظری کا زور بڑھ گیا ہے' تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

توہین رسالت کے لیے سزا' اس مقصد کے لیے رائج الوقت قانون' اس کا استعمال اور اس بارے میں خدشات کو حالیہ مقدمہ سے الگ کر کے دیکھا جائے' تب ہی ایک منصف مزاج آدمی اس قانون کے خلاف سارے مباحث میں کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہے۔

● بنیادی اور اوّلین سوال یہ ہے: کیا توہینِ رسالت ﷺ کوئی جرم نہیں ہے؟ اور جرم ہے بھی تو کیا اس پر کوئی سزا نہیں ہونا چاہیے؟

رسالت تو بڑی چیز ہے' دنیا بھر میں ہمیشہ سے کسی بھی انسان کی عزت و آبرو کو تحریری یا زبانی نقصان پہنچانا' ایک جرم قرار دیا گیا ہے' اور اسی لیے ہر معاشرے میں ہتکِ عزت (defamation) کے جرم کے لیے سزا کا قانون موجود رہا ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں کبھی یہ نہیں آیا کہ کسی دوسرے انسان کی بے عزتی اور توہین کرنا' ایک فرد کا انسانی اور بنیادی حق ہو سکتا ہے' اور اگر اس پر سزا دی جائے تو گویا ایک بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو گی۔ آج مغرب میں بھی یہی تصور اور یہی قانون ہے۔ ہاں' یہ بات ضرور ہے کہ مغربی قوانین کے تحت جس کی ہتکِ عزت ہوئی ہو' وہ خود ہی مدّعی بن سکتا ہے۔ "گویا" کیونکہ رسول' یا کوئی بھی دنیا سے گزرا ہوا آدمی' اب خود مدعی نہیں بن سکتا' اس لیے اس کی جتنی توہین کر لی جائے' یہ جرم قابل سزا نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس سے زیادہ بودی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ جب ایک عام آدمی کی ہتکِ عزت بھی قابلِ تعزیر جرم ہو' تو اُس شخص کی ہتکِ عزت کیوں نہ قابلِ تعزیر ہو' جو ایک ارب سے زیادہ انسانوں کو اپنی جان و مال ہی نہیں' اپنی ذات سے بڑھ کر محبوب ہے۔ جس کی عزت اور نام سے ان کی عزت اور نام وابستہ ہے۔ جس کی توہین سے ان کی اپنی ذات' ان کے نام' ان کی اپنی عزت' ان کے دین' ان کے آئین اور ان کی ملت کی توہین ہوتی ہے۔ آں حضور ﷺ کا مقام تو ہر مسلمان کے لیے یہی ہے۔ ایک مسلمان کی آبرو آپ ﷺ کے نام سے ہے: آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است۔ وہ مسلمان ہو نہیں سکتا' جب تک حضرت محمد ﷺ اسے اپنی جان' مال' والدین' دنیا کی ہر چیز' یہاں تک کہ اپنے نفس اور ذات سے زیادہ محبوب نہ ہوں:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (بخاری و مسلم)

● دوسرا سوال یہ ہے: کیا اس جرم کے لیے موت کی سزا بہت سخت اور احترامِ آدمیت کے خلاف ہے؟

اگر اعتراض فی نفسہٖ موت کی سزا پر ہے کہ یہ وحشیانہ ہے' تو وہ زمانہ گزر گیا جب تہذیب کے جوش میں موت کی سزا کو بالکل منسوخ کرنے کی ہوا چلی تھی۔ اب تو انتہائی مہذّب اور انسان دوست ہونے کے دعوے دار ملکوں میں' ایک کے بعد ایک' یہ سزا بحال کی جارہی ہے' بلکہ ہر ملک جہاں یہ سزا ختم کی گئی' وہاں کی بھاری اکثریت موت کی سزا کی بحالی کے حق میں ہے' نہ صرف موت کی سزا' بلکہ جسمانی سزا کے حق میں بھی۔۱۹۹۴ء میں جب سنگاپور میں ایک امریکی کو چھے بید مارنے کی سزا دی گئی تو' امریکی حکومت اور چند طبقات کی مخالفت کے باوجود' امریکیوں کی اکثریت نے اس سزا کی حمایت کی تھی۔ مغرب میں بھی اس قسم کے جرم پر سخت سزاؤں کے قوانین موجود ہیں' اور پہلے تو زندہ جلایا جاتا رہا ہے۔

اگر اعتراض یہ ہو کہ یہ سزا جرم کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے' تو اس جرم کی نوعیت کا فیصلہ تو وہی کرسکتے ہیں جن کو اور جن کے پورے معاشرے کو اس جرم سے نقصان پہنچ رہا ہو۔ محمد ﷺ کے کردار' اخلاق' صداقت' امانت' عدالت کو مجروح کرنا دراصل دین' ایمان' آئین' ریاست اور پوری اُمت مُسلمہ' سب کو مجروح کرنا ہے۔ اس لیے مسلمان ہی اس معاملے میں مناسب قانون سازی کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی مقننہ نے یہی سزا مناسب سمجھ کر یہ قانون منظور کیا ہے' ان کی اعلیٰ عدالتوں نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ یہ ایک جمہوری طریقے سے طے کردہ قانون ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمر قید کی سزا' موت کی سزا سے زیادہ وحشیانہ اور ظالمانہ سزا ہے' لیکن کوئی پارلیمنٹ یا کانگرس اپنی حدود میں یہ سزا دینے کا قانون بنائے' تو ہم اس کا فیصلہ کیسے بدلوا سکتے ہیں؟

● تیسرا سوال یہ ہے: کیا یہ قانون واقعی عیسائی اور ہندو جیسے اقلیتی فرقوں کے خلاف تعصّب و امتیاز پر مبنی ہے' ان کو کچلنے' دبانے اور حقوق سے محروم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے؟

جہاں تک قانون کا تعلق ہے' اس میں ایک حرف اور ایک نکتہ بھی ایسا نہیں بتایا جاسکتا جو اقلیتی فرقوں کے خلاف ہو یا ان کا کوئی حق سلب کرتا ہو۔ اس کا اطلاق کسی نام نہاد مسلمان پر بھی بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح غیر مسلم پر۔ تعصب و امتیاز کی بات اس وقت صحیح ہوسکتی ہے جب یہ گمان کیا جائے کہ اقلیتی فرقوں کی باقاعدہ نیت یا پروگرام ہے کہ وہ توہینِ رسالت کریں۔ ہمیں

یقین ہے کہ عمومی سطح پر ان کا ایسا کوئی ارادہ یا منصوبہ نہیں' اگرچہ باہر والے ان سے یہ حرکت کروا کے انہیں اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑانے اور نہیں پاکستان میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے منصوبے رکھتے ہوں۔ اگر اعتراض کی بنیاد یہ ہو کہ اس میں دوسرے مذاہب کے پیغمبروں کی توہین کو شامل نہیں کیا گیا ہے' تو اس اعتراض کو' اسلامی نظریاتی کونسل' (IIC) اور شریعت کورٹ کی سفارش کے مطابق دُور کیا جانا چاہیے۔

● چوتھا سوال یہ ہے: کیا یہ قانون اس لیے منسوخ کردیا جائے کہ ذاتی عناد یا فرقہ واریت کی خاطر اس کا غلط استعمال ہوا ہے' یا خدشہ ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے؟

اگر خود قانون میں ایسی کوئی خامی' خلا یا ابہام ہے' جو غلط استعمال کا ذریعہ بن سکتا ہے' تو ہماری رائے میں ایسی ہر خامی کو دور کیا جانا چاہیے' اور ممکنہ غلط استعمال کے خلاف ہر ممکن تحفّظ فراہم کرنا چاہیے۔ یہ ایسا معاملہ نہیں ہے کہ جو باہمی گفت وشنید سے حل نہ کیا جاسکتا ہو۔ ہمیں صرف مقامِ رسالت ﷺ کا تحفظ مطلوب ہے' بے گناہ لوگوں کو توہینِ رسالت ﷺ کے نام پر سزا دلوانا تو خود توہینِ رسالت ﷺ کے زمرے میں آسکتا ہے۔

لیکن اگر قانون کا غلط استعمال کسی فرد یا پولیس کے غلط کردار کی وجہ سے ہے' تو اس کا علاج قانون کی منسوخی نہیں ہے۔ اس وجہ سے تو ہر قانون کا غلط استعمال ہورہا ہے۔ قیامِ امن کے' انسدادِ دہشت گردی کے' لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کی روک تھام کے قوانین حکومتیں بے دردی کے ساتھ اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں' کیا اس وجہ سے ان سب کو منسوخ کردیا جائے؟ قتل کے قانون کے تحت پولیس اور بااثر لوگ بے گناہوں کو پھانستے ہیں' ان کو لوٹا جاتا ہے' بعض پھانسی پر بھی چڑھ جاتے ہیں' کیا ان کو بھی منسوخ کردیا جائے؟ کوئی بھی معقول آدمی یہ بات نہیں کہے گا۔ ذاتی عناد کی بنا پر بھی ملک میں بے شمار مقدمات کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اس ظلم کا کوئی خصوصی تعلق اقلیتی فرقوں سے نہیں۔

● پانچواں سوال یہ ہے: ''کیا قانونِ توہینِ رسالت ﷺ کی وجہ سے فرقہ واریت میں' مذہبی جنون میں' اقلیتوں کے خلاف تشدد میں اضافہ ہوا ہے' کہ یہ قانون منسوخ کردیا جائے؟

اگر شدت پیدا ہوئی ہے تو شیعہ سنی فرقہ وارانہ سوچ رکھنے والے محض چند جنگجو عناصر میں' جب کہ عام سطح پر تو شیعہ سنی ہم آہنگی پہلے کی طرح قائم ہے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ حد سے بڑھتی ہوئی قتل و غارت اور خوں ریزی کی وجہ نسلی اور لسانی تعصبات' سیاسی جھگڑے اور

انتقامی کارروائیاں ہیں۔ اس میں کوئی دخل قانونِ توہین رسالت ﷺ کا نہیں' اور نہ کسی دوسرے قانون کا۔ ان کارروائیوں کا شکار اکثریتی فرقہ ہے' نہ کہ اقلیتی فرقے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں روز بروز تشدد اور خوں ریزی بڑھ رہی ہے' اس معاشرے میں کیا صرف اقلیتی فرقوں کے لوگ ہی اس لہر سے بالکل محفوظ رہ سکتے ہیں؟ پھر تشدد کے ہر واقعے کو فوراً اقلیت کے خلاف ظلم قرار دینا کہاں تک قرینِ انصاف ہے؟ پاکستان میں آج تک کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ ذرا بھارت کے جمہوری' سیکولر' روشن خیال ملک پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے' جہاں کوئی مذہبی قوانین نہیں' جہاں مُلّا کا غلبہ نہیں' لیکن وہاں پر تو فرقہ وارانہ فسادات روز کا معمول ہیں۔

قرآن وسنت کے دلائل سے جس طرح شاتم رسول ﷺ کی سزا ثابت ہے' اور اس پر جس طرح فقہائے اُمت کا اجماع ہے' جس طرح اس پر' ماسوا دورِ غلامی کے' ہر مسلمان ملک میں' ہر زمانے میں عمل درآمد ہوتا رہا ہے' اور دورِ غلامی میں بھی مسلمان جس طرح اپنا خون دے کر اسے نافذ کرتے رہے ہیں' اسے بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔ اس بارے میں عام مسلمانوں کے درمیان نہ کبھی اختلاف رہا اور نہ کوئی شک وشبہ۔ جس کو تحقیق کا شوق ہو' اس کے لیے حسب ذیل کتب کا مطالعہ کافی ہے:

(۱) محمد اسماعیل قریشی: ناموسِ رسول ﷺ اور قانونِ توہینِ رسالت ﷺ

(۲) امام ابن تیمیہ: **الصارم المسلول علی شاتم الرسول ﷺ**

(۳) تقی الدین سبکی: **السیف المسلول علی من سبّ الرسول ﷺ**

(۴) ابن عابدین: **تنبیہ الولاۃ والحکام علی احکام شاتم خیر الانام ﷺ**

● لوگ چھٹا سوال یہ پوچھتے ہیں کہ: رحمۃ للعالمین ﷺ نے تو گالیاں سن کر' پتھر کھا کر' دعا دی' اب ان کو گالی دینے والے کو موت کی سزا دی جائے؟

ایسے لوگ رحمت کے مفہوم سے آگاہ نہیں۔ رحمت کا تقاضا جہاں عفو ودرگزر ہے' وہاں انصاف بھی ہے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے: واقعۂ افک میں قذف کے مرتکبین کو کوڑے لگوائے' زنا کے مجرموں کو سنگسار کرایا' مسلح لشکر لے کر نکلے جس نے بدر کے میدان میں سردارانِ قریش کو تہہ تیغ کر دیا' فتح مکہ کے دن جب ہر جانی دشمن کو معافی مرحمت فرما دی گئی' چھے مرتدین اور شاتمین کے قتل کا حکم صادر ہوا۔ آپ ﷺ یہ نہ کرتے تو فساد مچتا' اور زیادہ ظلم برپا ہوتا۔

آپ ﷺ نے کوئی حکم اپنی ذات کی خاطر نہیں دیا' دین اور ملت کے تحفظ کی خاطر دیا۔

جب رسالت ﷺ ہی ایمان کی' دین کی' ملت کی بنیاد ہے' اس کی زندگی کی ضمانت ہے' تو توہین رسالت ﷺ کے مجرم کو سزا دینا عین رحمت کا تقاضا تھا۔ اسی لیے یوم قیامت کو —— جس دن نیکوکاروں کو انعام سے نوازا جائے گا' مگر بدکار جہنم میں جھونکے جائیں گے —— اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت' رحمانیت اور رحیمیت کا دن قرار دیا ہے۔ (الفاتحہ' الانعام)۔

شانِ رسالت ﷺ میں گستاخی کے مرتکب فرد کے لیے موت کی سزا کے قانون کی تائید اور حمایت کچھ فقہاء وعلماء' مُلّا اور جنونیوں ہی کا جرم نہیں ہے' بلکہ وہ اچھے اچھے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان حضرات' جنھوں نے روحِ اسلام کو ضائع نہ کیا اور مقامِ محمدی ﷺ سے آگاہ رہے' کسی بھی مداہنت کے بغیر اس مذہبی جنون کے جرم میں شریک رہے۔

غازی علم الدین شہید [۴ دسمبر ۱۹۰۸ء - ۳۱/اکتوبر ۱۹۲۹ء] نے [شانِ رسالت ﷺ میں گستاخی پر مبنی کتاب کے ناشر] راج پال کو قتل [۶/اپریل ۱۹۲۹ء] کیا تو اس کے مقدمے کی پیروی قائداعظم محمد علی جناح [م: ۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء] نے کی۔ علامہ محمد اقبال نے رشک کے ساتھ فرمایا: اسیں گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا (ہم باتیں کرتے رہ گئے' اور ایک بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)۔ علم الدین شہید کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا' اور اس فضا میں یہ شعر بھی کہا:

ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر وقیمت میں ہے جن کا خون حرم سے بڑھ کر!

شانِ رسالت ﷺ میں گستاخی کے جرم میں ایک خانساماں نے ایک انگریز میجر کی بیوی کا کام تمام کر دیا۔ سر میاں محمد شفیع [م: جنوری ۱۹۳۲ء] نے' جو برطانیہ کے زیر تسلط ہندوستان میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی تھے' اس کے مقدمے کی پیروی کی۔ دورانِ بحث ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ہائی کورٹ کے انگریز جج نے انھیں بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا: سر شفیع' کیا آپ جیسے ٹھنڈے دل ودماغ کا بلند پایہ وکیل بھی اس طرح جذباتی ہوسکتا ہے؟ سر میاں محمد شفیع نے رنج اور حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا: جناب' آپ کو نہیں معلوم' ایک مسلمان کو اپنے پیغمبر ﷺ کی ذات سے کتنی گہری عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔ سر شفیع بھی اگر اُس وقت وہاں

ہوتا تو وہ بھی یہی کر گزرتا جو اس ملزم نے کیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے بعض مسیحی بھائیوں نے اس قانون کے معاملے میں حق پسندانہ اور معتدل مسلک اختیار کیا ہے۔صوبہ بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر آنجہانی بشیر مسیح کے الفاظ ایسے ہی موقف کے آئینہ دار ہیں' انہوں نے کہا تھا:

''ہم اس قانون کے خلاف نہیں۔کوئی بھی سچا مسیحی' توہینِ رسالت ﷺ کا تصور نہیں کر سکتا' اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر واقعی کوئی اس قبیح جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ موت سے بھی سخت سزا کا حق دار ہے۔لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی بے گناہ کو اس قانون کا نشانہ بنایا جائے۔''

اسی طرح ماہنامہ ''کلامِ حق'' میں پادری ڈاکٹر کے ایل ناصر کے بیٹے میجر ٹی ناصر کے الفاظ ہیں:

''ہم مسیحی' تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۵۔سی یعنی گستاخِ رسول ﷺ [کی سزا] کے مخالف نہیں۔ ہم صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ ایک خصوصی کمیشن بنایا جائے' غیر جانبدارانہ تحقیقات کریں اور اگر ملزم واقعی مجرم ہو تو اس کو قانون کے مطابق سزا دی جائے' ورنہ بصورت دیگر رہا کر دیا جائے۔مقدمہ بھی خصوصی عدالت میں چلایا جائے' اور ملزم کو تمام قانونی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں' تا کہ اقلیتوں' خاص طور پر مسیحی اقلیت کو تحفظ وانصاف کا احساس ہو۔''

اور یہ مطالبات بجا ہیں۔لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مسیحی لیڈروں کی اکثریت' سوچے سمجھے بغیر' قانون توہین رسالت ﷺ کی اندھی مخالفت پر تل گئی ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف مغربی سامراجی طاقتوں کے آلہ کار بن رہے ہیں' دوسری طرف پاکستان میں اسلام دشمن اور سیکولر عناصر کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے ہیں۔

ہم پورے خلوص اور دردمندی سے ان کی خدمت میں ادب سے عرض کریں گے' کہ اگر ان کے پیش نظر اس قانون کے بارے میں خدشات کے خلاف ضروری تحفظات حاصل کرنا ہے' بلکہ پاکستان کے شہری ہونے کے ناتے پاکستان میں اپنا جائز مقام حاصل کرنا ہے' تو انہوں نے ایک غلط راستہ اختیار کیا ہے۔نہ بیرونی طاقتوں کی مداخلت سے انہیں یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے' نہ سیکولر عناصر کی مدد سے کچھ پا سکتے ہیں' اگرچہ وہ اقتدار میں بھی آجائیں۔

ان کے لیے درست اور معقول راستہ یہ ہے کہ وہ محبِ اسلام ممتاز شہریوں اور حق پسند

علماء اور دینی جماعتوں سے گفت وشنید کا آغاز کریں' انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کریں' ممکن ہو تو ایک مشترک مسلم اینڈ کرسچین کونسل تشکیل دیں۔ دلیل اور شواہد کے ساتھ مسلمانوں پر زور دیں کہ وہ خاص طور پر اس قانون کے ضمن میں اسلام کے قانونِ عدل وشہادت کے تقاضوں کی تکمیل یقینی بنائیں۔ وہ ایسی ترامیم کرانے میں ان کی مدد کریں جو قانون کو بے اثر بنائے بغیر کی جا سکتی ہیں' اور ان کے ساتھ انہی بنیادوں پر معاملہ کریں' جو حضرت محمد ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ اختیار کیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح دونوں کے تعلقات بھی خوش گوار ہو جائیں گے اور ان مسائل کا حل بھی خوش اسلوبی سے نکل آئے گا۔

شاید انہیں اسلام کے قانونِ عدل کے ان تقاضوں کا علم نہیں' جن کا نفاذ ان کے خدشات کے ازالے کے لیے کافی ہو سکتا ہے:

۱) حد کی سزا صرف حکومت دے سکتی ہے' کسی مسلمان کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں۔

۲) عدالت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ گواہوں کی مناسب جانچ پڑتال کرے۔ اس لیے کہ حد کی سزا میں شہادت کا معیار' عام شہادت کے معیار سے بہت زیادہ سخت اور غیر معمولی ہے۔ ایسے گواہوں کی شہادت قبول ہوتی ہے جو گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہوں' صادق القول اور عادل ہوں' اور مزید برآں تزکیۃ الشہود کے معیار پر بھی پورا اترتے ہوں۔

۳) جرم ثابت ہونے میں ایک شبہ بھی رہ جائے تو شک کا فائدہ بھی اسلامی قانون کی رو سے ملزم کو پہنچتا ہے۔ حدیثِ مبارک ہے: اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ' حدود کی سزاؤں کو شبہات کی بنا پر ختم کرو۔

۴) عدالت ملزم کی نیت کا تعین بھی کرے گی' کیونکہ نیت کے بغیر اسلامی قانون میں کوئی جرم مستوجب سزا نہیں ہوتا۔

۵) حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی اسلامی قانون کا ایک بنیادی اصول ہے کہ ایک مجرم کو بری کر دینے کی غلطی ایک بے گناہ کو سزا دینے کی غلطی سے بہتر ہے۔

۶) بجائے اس کے کہ ہمارے مسیحی بھائی پاکستان کی سیکولر حکومت کے وعدوں پر زندہ رہیں یا باہر کی مسیحی طاقتوں سے آس لگائیں' کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ مسلمان' عیسائی' ہندو مل کر ایک متفقہ ترمیمی بل حکومت اور پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیں' جو اسلامی قانون کے مطابق بھی ہو اور اقلیتوں کے لیے انصاف اور تحفظ کا ضامن بھی۔ ہماری رائے میں علماء

اور دینی جماعتوں کو اس مقصد کے لیے عیسائی رہنماؤں سے مکالمہ شروع کرنا چاہیے۔ قانون توہینِ رسالت ﷺ پر مخالفانہ ردّعمل نے جو آئینہ ہمیں دیا ہے' اس میں مسلم ملّت کی قوت کا اصل سرچشمہ بھی عیاں ہو رہا ہے۔

یہ سرچشمہ وہی ہے جس کے پیچھے ہمارے دشمن چودہ سو سال سے آج تک لگے ہوئے ہیں۔ ہماری قوت و توانائی کا سامان اس اسلحہ' قرض اور امداد میں نہیں ہے جو ہمارے دشمن خود ہمیں فراہم کر رہے ہیں۔ یہ سرچشمہ تو روزِ اوّل سے دلِ مسلم میں مقامِ مصطفیٰ ﷺ ہے' عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہے' اور ملت کی پوری زندگی میں اتباع اور اطاعتِ مصطفیٰ ﷺ سے منسوب ہے۔ ہمیں اسی سرچشمے سے سیراب ہونے میں لگ جانا چاہیے۔

آج تاریخ کا اسٹیج' اسلام اور مغرب کے درمیان معرکے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ بظاہر ہمارا اور مغرب کا کیا مقابلہ؟ نہ ہمارے پاس اسلحہ' نہ ٹیکنالوجی' نہ معاشی ترقی' نہ اتحاد' نہ لیڈر شپ' نہ منزل اور نہ مقصد۔ لیکن ان میں سے ہر چیز ہمیں حاصل ہو جائے گی' اگر ہم قوت اور توانائی کے اس سرچشمہ تک پہنچ جائیں:

کیمیا پیدا کن از مُشتِ گِلے　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے
دل زعشقِ او توانا می شود　　خاکِ ہم دوشِ ثریا می شود!

اس سے زیادہ فریب انگیز مغالطہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں: ہم کو ترقی پسند بننا ہے یا بنیاد پرست؟ ہمیں نہیں معلوم بنیاد پرست کے کیا معنی ہیں' لیکن ہم کو یہ ضرور معلوم ہے کہ ہماری بنیاد تو حضور ﷺ کی ذات' آپ ﷺ کی لائی ہوئی کتاب' آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ ہم' جو اس بنیاد کے ناتے بظاہر بنیاد پرست ہیں' فی الحقیقت سب سے بڑھ کر ترقی پسند ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ضمن میں اگر امریکا کی انگلی پکڑ کر چلے تو ترقی نہیں' موت اور ذلّت کا گڑھا ہمارا مقدر ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر چلنے والے ترقّی یافتہ مسلمان ممالک کے ڈھانچے ہمارے سامنے بہت موجود ہیں:

کشودم پردہ را از روئے تقدیر　　مشو نومید و راہِ مصطفیٰؐ گیر!
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر　　بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو!

دامنش از دست دادن موت است' حضور ﷺ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا پروانۂ موت ہے۔ آج کل مسلمان ہر جگہ' خصوصاً وطن عزیز پاکستان میں' زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا

ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں علاج کیا ہے' حل کیا ہے؟ علاج اور حل تو ایک ہی ہے۔ پہلے بھی' قوم زندگی از دمِ او یافت' حضور ﷺ کے دم سے ہی زندگی ملی تھی' اور آج بھی سب کچھ آپ ﷺ کا دامن پکڑ کے' آپ ﷺ کا مشن پورا کرنے' اور آپ ﷺ کے پیچھے چلنے ہی سے ملے گا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید صاحب حفظہ اللہ
کے خطباتِ جمعۃ المبارک
انتہائی دلکش و دیدہ زیب طباعت و فور کلر ٹائٹل کے ساتھ
دعوتی و تبلیغی مقاصد کے لیے بے انتہا مفید
ہر کتاب پر امیر تنظیم کا مختصر تعارف
پاکٹ سائز میں درج ذیل عنوانات
1۔ خودکش حملوں کا تدارک اور اللہ کی مغفرت کا مستحق کون؟
2۔ میرے والد گرامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی دینی خدمات
3۔ قیامِ نظامِ عدل وقسط　4۔ آزادی کی تقاضا: خود احتسابی
5۔ توبہ کی فضیلت　6۔ اسلام میں حسن اخلاق کی اہمیت
7۔ قرآن حکیم کا پیغام　8۔ جنگوں کی پیشین گوئیاں (بانی تنظیم اسلامی)
9۔ گستاخ رسولؐ کی سزا (قرآن وسنت رسول ﷺ کی روشنی میں)
تنظیم اسلامی کے تمام حلقہ جات سے حاصل کر سکتے ہیں
قیمت مکمل سیٹ صرف 75 روپے
مرکز تنظیم اسلامی　67۔ اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو، لاہور　فون: 042-36316638 042-36366638

دین اور فریضۂ دینی

سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں

محمد فہیم

(۱) وحدانیّت

اللہ ایک ہے' اکیلا ہے' وہ ربّ ہے' خالق ہے' مالک ہے' وہ الحیّ القیُّوم ہے۔ اس کی ذات وصفات ذاتی اور قدیم ہیں۔ اس کا نہ کوئی ذات میں شریک ہے' نہ صفات میں' نہ عبادت میں اور نہ دُعا میں۔ ہمارا ذہن اور تصور اُس کی ذاتِ اقدس کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہستی ہے۔ وہ ہر چیز پر ہر وقت ہر گھڑی قادر ہے۔ اس کے حکم اور اذن کے بغیر ایک پتا بھی جنبش نہیں کرسکتا۔ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے' وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے' وہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔

(۲) خالق صرف باری تعالیٰ ہے' باقی سب اس کی مخلوق ہے

خالق صرف وہی باری تعالیٰ ہے' باقی سب اس کی مخلوق ہے۔ مخلوقات میں اس کی شاہکار مخلوق انسان ہے جو جسم اور روح کا مرکّب ہے' وہ روح جس کی نسبت باری تعالیٰ نے اپنی طرف کر دی ہے: ﴿فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۝﴾ (الحجر:۲۹ اور ص ۷۲) ''پھر جب میں ٹھیک کروں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی روح سے تو گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے''—— اُس نے جن وانس کو اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''—— ان کو محدود آزادی دی تا کہ وہ (باری تعالیٰ) جانچے پر کھے کہ وہ اس قلیل دُنیوی زندگی میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ

الْغَفُوْرُ۝۲﴾ (المُلك) ''(اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم کو آزمائے کہ کون نیک عمل کرتا ہے۔ وہ غالب اور بخشنے والا ہے''—— ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۝۲﴾ (الدھر) ''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا' ہم اس کو الٹتے پلٹتے رہے' پھر بنا دیا ہم نے اس کو سننے والا' دیکھنے والا''—— لہٰذا یہ دُنیوی زندگی ایک لحۂ امتحان ہے اور یہ دنیا دارُ المِحن ہے۔ اصل زندگی موت کے بعد شروع ہوگی: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۝۶۴﴾ (العنکبوت) ''اور یہ دنیا کی زندگی تو بس (جی کا) بہلاوا اور کھیل تماشا ہے' اور اصل زندگی تو دارِ آخرت (کی زندگی) ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے!'' اس لامحدود زندگی کا دار و مدار انسان کی محدود دنیوی زندگی میں اس کے رویّے اور عمل پر ہو گا۔ اللہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب سے دوچار کرے گا۔ وہ اپنے فیصلوں میں مختارِ مطلق ہے' وہ کسی کام پر مجبور نہیں۔

(۳) انسان کو استعدادات سے مسلّح کر کے دارالامتحان میں بھیجا گیا

انسان کو استعدادات (faculties) سے مسلّح کر کے دار الامتحان میں بھیجا گیا ہے۔ اسے عقل وشعور' وجدان' محبت' جذبہ شکر' احساس' سوچ وفکر' ذہن وقلب اور حواسِ خمسہ کے زیورات سے آراستہ کر کے اور اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر اس غرض سے بھیجا کہ وہ یہاں اصل مالک کی مرضی کے مطابق خود بھی زندگی گزارے اور اس کی مرضی کی تنفیذ کے لیے بھی جدوجہد کرے۔ ان استعدادات کی بنا پر وہ مکلّف ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بحیثیت رب پہچانے۔ تاہم مزید احسان اور قطع عذر کے لیے اور اتمامِ حجّت کے علاوہ اس باری تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی تفصیلات سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ سلسلۂ انبیاء ورسل وحی کا اہتمام فرمایا تا کہ کل انسان یہ نہ کہہ سکے کہ یا اللہ! مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا۝۱۶۵﴾ (النساء) ''بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تا کہ باقی نہ رہے لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد۔ اور اللہ زبردست' حکمت والا ہے۔''

(۴) اللہ نے انسان کو دو قسم کے علوم سے نوازا

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قسم کے علوم سے نوازا ہے۔ جب اس کے سر پر خلافت کا تاج

رکھ کر زمین پر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اسے علم الابدان بالقوہ سکھایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾﴾ (البقرۃ) ''اور سکھلا دیے آدم کو اللہ نے سب چیزوں کے نام' پھر سامنے کیا فرشتوں کے' پھر فرمایا بتاؤ مجھ کو نام ان چیزوں کے اگر تم سچے ہو۔''

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اسے ہر قسم کی استعدادات سے نوازا' لہٰذا وہ کسب کر کے ان علوم کو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ علوم (علم الابدان) کل انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں' جو بھی ان پر محنت کرے گا بقدر محنت حصہ پائے گا اور مستفید ہو سکے گا۔ یہ علم کا وہ خزانہ ہے جس کے ذریعے انسان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں انکشافات' معلومات اور ایجادات کے انبار لگا کر ستاروں تک کمند ڈالنے کی راہ نکالی ہے۔ علم کا یہ شعبہ بلا امتیاز ہر کسی کے لیے کھلا ہے' خواہ وہ اللہ کو مانتا ہے یا نہیں مانتا' آخرت پر یقین رکھتا ہے یا نہیں رکھتا' وحی اور سلسلۂ نبوت پر ایمان لاتا ہے یا نہیں لاتا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بغیر امتیاز کے اپنے اس خزانے کا دروازہ کھول کے رکھ دیا ہے۔

تاہم دوسرا سلسلۂ علم' علم الادیان ہے جس کا سرچشمہ وحی خداوندی اور کتب آسمانی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنے بندوں تک پہنچانے کا بندوبست فرمایا ہے۔ اس کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن کریم ہے' جو آخری نبی سید المرسلین' محبوب ربّ العالمین' ختم المرسلین وخاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا گیا۔ انسان اس وحی کی روشنی میں مکلّف ہے کہ اپنے لیے صحیح راہ کا تعین کرے اور اس راہ پر چلنے کی کوشش کرے جو نبی اکرم ﷺ نے بتائی ہے۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' جو کوئی بھی ایسا دعویٰ کرے وہ ضرور ثَلَاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ ہی میں سے ہو گا۔ جیسے سابقہ زمانے کا مسیلمہ کذاب' اسود عنسی' شجاع وغیرہ اور ماضی قریب کا غلام احمد قادیانی ---- قرآن اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے جو تا قیامت بلکہ تا ابد محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٩﴾﴾ (الحجر) ''ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں''۔ قرآن کے متعلق ہمارے عقیدے کے تین بنیادی اصول ہیں' جن کو ہر وقت مستحضر رکھنا نہایت ضروری ہے:

(۱) یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔
(۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر بواسطہ جبریل امین نازل ہوا ہے۔
(۳) یہ من وعن محفوظ ہے۔ جیسا حضور ﷺ نے اُمت کو دیا تھا اُسی حالت میں یہ تا ابد

محفوظ رہے گا۔

اصطلاح میں یہ وحی متلو ہے۔ ایک غیر متلو وحی ہے جو صحیح احادیث کی صورت میں محفوظ ہے۔ وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے حضور ﷺ کے فرمودات ہیں۔ ع گفتۂ او گفتۂ اللہ بود!

(۵) اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل ''دین'' ہے

اسلام صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یہ ایک مکمل ''دین'' ہے' جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر شعبے کے لیے مکمل بنیادی رہنما اصول دیتا ہے۔ قرآن اس اصطلاح یعنی ''دین'' کو مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے بمنزلہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس کی مکمل تشریح وتعبیر پیش کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے اپنا سفر اسی قرآن کی روشنی میں شروع کر کے مکمل فرمایا۔ آپؐ نے اسلامی زندگی کی قرآن کی روشنی میں جو تشریح فرمائی وہ اسلام کی بنیادی اصطلاح ''عبادت'' سے تعبیر ہے۔ اسی عبادت کو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں جن وانس کا مقصدِ تخلیق فرمایا ہے۔ اسی عبادت کے تقاضے ہیں جو آگے جا کر شہادت علی الناس اور اقامتِ دین جیسی اصطلاحات کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام بحیثیتِ دین اپنے ماننے والوں سے جو تقاضا کرتا ہے وہ کچھ یوں ہے:

(i) عبادتِ ربّ: اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم مکمل عبدیت اختیار کر کے اُس کے بندے بنیں۔ ہم پورے تسلیم ورضا کے ساتھ محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ کے آگے بچھ جائیں۔ ہماری پوری پوری زندگی ہمہ وقت' ہمہ جہت اور ہمہ صفت اللہ ہی کی مرضی کے مطابق گزرے۔ اسی ''عبدیت'' کو انفرادی طور پر مطلوبہ شکل میں ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ''عبادات'' کا ایک نظام ہمیں عطا فرمایا ہے' یعنی کلمۂ طیبہ کے بعد نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ---- ان فرض ''عبادات'' کا مفاد یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہم بطریق احسن اس فریضہ ''عبادتِ ربّ'' کو انجام دے سکیں۔ ان عبادات سے تازگی اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

(ii) شہادت علی الناس: دوسرا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ اس ''عبادت'' کے لیے لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ یہ عبادتِ ربّ ایک عظیم خیر ہے' لہٰذا ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کو اس میں شریک کرنے کی کوشش کریں۔ بطور ایک اچھے انسان بھی یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ جس چیز کو ہم خیر تسلیم کرتے ہیں اس میں اپنے ابنائے نوع کو شریک کریں اور اُمت کا بحیثیت اُمت

فریضہ بھی ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) ''اور اسی طرح بنایا ہم نے تم کو اُمّت معتدل تاکہ تم گواہ ہو لوگوں پر اور رسول گواہ ہو تم پر'' —— ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران:۱۱۰) ''تم ہو بہتر سب اُمتوں میں سے جو بھیجی گئی عالم میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کے اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر'' —— ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران) ''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کے اور منع کرے برائی سے۔''

(iii) <u>اقامتِ دین یا اظہارِ دین:</u> سیرت النبی ﷺ کے اجتماعات میں بالعموم نعت خوانی کے علاوہ حضور نبی اکرم ﷺ کی صفاتِ عالیہ، بلند اخلاق، سخاوت، عفو و درگزر، صبر و مصابرت، غرض تمام پہلوؤں پر بھرپور بحثیں ہوتی ہیں —— لیکن بندگیٔ رب، شہادت علی الناس اور خصوصاً اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے سیرتِ مطہّرہ سے جو پیغام ملتا ہے اس کا حق کما حقّہ ادا نہیں کیا جاتا، بلکہ بعض تقاریر اور مباحث سے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ غلبہ و اقامت دین کے لیے جدّوجہد کی دین میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مسلمانوں کو بس یہی تلقین کی جاتی ہے کہ خود نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ادا کرتے رہا کرو یا زیادہ سے زیادہ ان ہی چیزوں کی تلقین کرو۔ گویا اسی کام کو کل دین سمجھ لیا گیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کام کرتے رہا کرو، لوگ اچھے بنتے رہیں گے اور ایک اچھی اجتماعیت خود بخود وجود میں آ ئے گی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں سیرتِ مطہّرہ کا گہرائی اور گیرائی میں اُتر کر مطالعہ کرنا ہوگا اور اس کے اصل پیغام کو سمجھنا ہوگا —— میں سمجھتا ہوں کہ فریضۂ اقامتِ دین کو نظر انداز کرکے گزرنے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا سیکولر نظریات کے نرغے میں ہے۔ ستاون مسلمان ممالک کے ہوتے ہوئے بھی کسی بھی خطۂ ارضی پر اللہ کے دین کو غلبہ حاصل نہیں۔ سیکولرزم، مغربی مادہ پرستی اور الحادی نظریات کا غلغلہ اور طنطنہ ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اس طرف متوجہ ہوں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان اور خصوصی مشن ہی یہ تھا کہ آپ اللہ کے دین کو غالب کرکے اسے اُمت کے لیے بطور نمونہ (ماڈل) سپرد کر دیں۔ چنانچہ سیرت مطہّرہ تو کُل کا کُل اسی اقامت دین کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ

میں چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں تاکہ غلط فہمی کا ازالہ ہو کر بات کھل کر سامنے آسکے۔

اسلام اپنی فطرت کی بنیاد پر بحیثیت دین اپنا غلبہ چاہتا ہے، بالفاظِ دیگر دینِ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر اپنی حکمرانی چاہتا ہے، خواہ یہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں، تین مقامات پر الفاظ میں ایک شوشے کی تبدیلی کے بغیر، یہی بیان فرمائی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبہ:۳۳، الفتح:۲۸ اور الصّف:۹) ''اس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غالب کردے ہر دین پر'' --- آپؐ نے بحیثیت آخری رسول تشریف لا کر دین کی تکمیل فرما دی اور اُسے ایک بالادست نظام کی شکل میں غالب فرما کر ایک نمونہ کے طور پر انسانیت کے سامنے پیش فرمایا اور حجت قائم کر دی۔

تمدنی ارتقاء کے فلسفہ کے حوالہ سے اگر ہم انسانی زندگی پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے جب انسان ایک فرد کے طور پر انفرادی زندگی گزار رہا تھا اور اس کی کوئی اجتماعیت نہیں تھی، وہ اکیلا کسی غار یا پہاڑی ٹیلے پر رہتا تھا تو اس کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ وہ اللہ کا ادراک کرکے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ وہ کسی اجتماعیت یا نظامِ حکومت، کسی میونسپلٹی یا ادارے کا حصہ نہ تھا۔ لیکن آگے چل کر جب اس کی زندگی اجتماعیت کا جزو بن گئی تو اب اسے ایک ضابطہ اور اجتماعی نظام کی ضرورت پڑی، اب وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اب وہ مجبور ہے کہ وہ اس مروّجہ اجتماعی اصول وضوابط کے تحت زندگی گزارے۔ صاف اور قابل فہم بات ہے کہ اگر یہ اجتماعی نظام غیر اللہ کے ہاتھ میں ہے تو یہ طاغوتی نظام ہے، ظالمانہ ہے، بے خدا ہے، غیر معتدل ہے، سیکولر ہے، الحادی ہے۔ اگر ایک ''بندۂ خدا'' (عبد) اطمینان کے ساتھ پاؤں پھیلا کر سوتا ہے، اسے اس نظام سے کوئی کراہت نہیں، اسے اس نظام کو ہٹانے کی کوئی فکر نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس پر راضی اور خوش ہے۔ جبکہ اللہ کے رسول ﷺ ایسے ہی ایک بے خدا نظامِ اجتماعی کو تلپٹ کرکے اس کی جگہ خدائی اجتماعی نظام برپا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے اور آپؐ نے ایسا کرکے دکھایا۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک بے خدا اجتماعی نظامِ زندگی میں ''بندگیٔ ربّ'' کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے؟ آج اگر اجتماعیت کے شعبوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ ایک فرد اجتماعیت کے پنجے میں کس قدر مضبوطی کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔ آیئے ہمارے انفرادی و اجتماعی زندگی کے دائروں میں سے پانچ بڑے دائروں کے اندر مختلف شعبہ جات کا صرف نام لے کر دیکھیں کہ انسانی زندگی کس طرح اجتماعیت کے اندر پھنس کر رہ گئی ہے:

(i) عبادات کا دائرہ: یہ مشتمل ہے کلمۂ توحید (عقیدہ)' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ پر۔

(ii) اخلاقیات کا دائرہ: سچ' خوش کلامی' نرمی' حلم' بردباری' صبر و شکر' تواضع و انکساری' دریادلی' عدل و انصاف' ایثار' استقامت و استقلال' خود داری' عفت و پاکبازی' بہادری' شرم وحیا' توکل' تقویٰ وغیرہ۔

(iii) معاشرت کا دائرہ: نکاح' طلاق' رضاعت' مہر' حقوقِ زوجین' والدین' ذوی القربیٰ' پڑوسی' محلّہ' شہر' ملک' جانور' ماحولیات۔

(iv) معاملات کا دائرہ: تجارت' شراکت' مضاربت' رہن' وصیت' وراثت' قرض' امانت' عاریت' اجارہ' زراعت' صنعت' لین دین۔

(v) اسلامی ریاست: امر بالمعروف' نہی عن المنکر' اقامت صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' نظامِ قضا' عدالتیں' امن و امان' امورِ داخلہ' پولیس' خزانہ' خارجی امور' فوج ودفاع' جہاد' سفارت' بین الاقوامی تعلقات وغیرہ۔

اب ذرا ان شعبوں کو دیکھیں (مزید بھی ہو سکتے ہیں) تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ انسان تب عبادتِ رب کا حق ادا کر سکے گا جب یہ اجتماعی نظام بھی مشرّف بہ اسلام ہو اور ان شعبوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قواعد وضوابط پر چلایا جا رہا ہو۔ یہی تو فرق ہے' ایک سیکولر انسان یہی تو کہتا ہے کہ بس اپنی عبادت کرو (یعنی نماز' روزہ وغیرہ) اور نظام کو مت چھیڑو۔ یہ انسان کا کام ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جن اصولوں پر چاہے اس کو چلائے۔ اب اگر کوئی عالم' مولوی یا دانشور بھی یہی کہے کہ بھائی نظام کی ضرورت نہیں تو پھر وہ بھی تو سیکولر بات ہی ہوئی' جبکہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان یہی ہے کہ آپ نے اللہ کی حکومت قائم کر کے ایک خلافت بالفعل برپا کردی (قرآنی آیات کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے)۔

اس بحث کا نچوڑ یہ ہوا کہ جس طرح انفرادی حیثیت میں ایک انسان عبادتِ ربّ پر مکلّف اور مسئول ہے اسی طرح جس نظام کے اندر وہ سانس لیتا ہے اس کے بارے میں بھی وہ مکلّف ہے کہ اس کو اللہ کے حکم کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنی سی کوشش کرے۔ اگر تو نظام اللہ کی کتاب اور سنّت رسولؐ کے مطابق ہے تو اسے برقرار رکھنے کے لیے تمام عوامل کو بروئے کار لائے اور اگر ایسا نہیں تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں پر استوار کرنے کی جدّوجہد کرے۔ صدیقِ اکبر حضرت ابوبکر ؓ کی سیرت سے متعلق منبر و محراب سے یہ جو بیان

کیا جاتا ہے کہ تارکین زکوٰۃ کے بارے میں آپؓ نے فرمایا تھا: ''اگر اللہ کے رسولؐ نے زکوٰۃ میں اُونٹ کے ساتھ رسی بھی وصول کی ہو اور اب کوئی شخص اس سے انکار کر رہا ہو تو ابوبکر کی تلوار اس کے خلاف بے نیام ہوگی'' یہ کیا ہے؟ یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کے قائم کیے ہوئے دین میں کسی معمولی چیز کی کمی کے بھی وہ روادار نہیں تھے —— اب اگر معاملہ اتنا بگڑا ہوا ہے اور ہمارے بھائی یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ نظام کی تبدیلی یا دین کے غلبہ کے لیے کوئی کوشش نہیں ہونی چاہیے تو یہ بات تو صریحاً حضور ﷺ کی تعلیمات اور آپ کے عمل (سیرت مبارکہ) کے خلاف متصوّر ہوگی —— لہٰذا ازروئے قرآن عظیم وسیرتِ نبویؐ اقامتِ دین کے لیے جدّوجہد دینی فریضہ ہے۔

(۶) دعوت

حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جان نثار ساتھیوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے قرآن کے ذریعے دعوت دی۔ گویا قرآنی مقناطیس کو معاشرہ پر پھرایا اور جو صالح عناصر اُس سے چمٹ گئے اُن کے دلوں میں ایمان کی حقیقت کو کھبایا (hammer کیا)۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۷) ''اللہ نے محبت ڈالی تمہارے دلوں میں ایمان کی اور کھبا دیا اسے تمہارے دلوں میں''۔ حضور ﷺ نے جو بھی دعوت دی' انذار فرمایا' تبشیر فرمائی' تعلیم دی' تبیین کی' تدریس کی' تعلّم و تعلیم فرمائی' ابلاغ و تبلیغ کی' امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا' ان تمام کے لیے قرآن ہی کو آلہ اور ذریعہ بنایا۔ آپؐ نے ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾﴾ (الفرقان) ''کے مصداق قرآن کے ساتھ ''جہادِ اکبر'' فرمایا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی امت ارتقاء کے اس موڑ پر ہے جہاں یہ دنیا ایک عالمی گاؤں (global village) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ کسی طور پر معاشرے اور اوپر سے چھائے ہوئے نظام کی دستبرد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ اس نظام میں جکڑے ہوئے ہیں' بلکہ ایسے بندھے ہوئے ہیں جیسے ایک پرندہ کسی جال میں پھنسا ہوا ہو۔ اگر نظام پر طاغوت مسلّط ہے (جیسے کہ اس وقت بالفعل ہے) تو آپ اور ہم لامحالہ اس طاغوتی نظام کے کُل پُرزے بنے ہوئے ہیں اور اس صورت میں ''عبادت'' بھی سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ کا مصداق بن جاتی ہے: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾ (یوسف) ''اور نہیں ایمان لاتے اکثر لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شرک بھی کرتے ہیں۔''

اس دعوت کے ذریعے حضور ﷺ کو جو افراد (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میسر آ گئے ان کو آپؐ نے ایک منظم جماعت کی صورت دے کر ''سمع وطاعت'' (قرآن وحدیث کی اصطلاح) کی بنیاد پر ان کی تربیت فرمادی' قرآن ان کے دلوں میں اتارا اور پھر صبر محض کی بھٹیوں سے گزار کر اُن کو کندن بنایا۔ بدر' احد' حنین' احزاب' تبوک وغیرہ مراحل طے کرتے ہوئے انہیں باطل کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے مواقع میسر آتے رہے اور بالآخر نتیجہ یہ نکلا: ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (بنی اسراء یل) ''اور کہہ دو! حق آیا اور باطل نکل بھاگا' بے شک باطل ہے ہی نکل بھاگنے والا۔''

ایک غلط فہمی

عام طور پر یہ بات ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت پھیلائی جا رہی ہے اور مغرب اور مغرب زدہ میڈیا کے ذریعے اسے promote کیا جا رہا ہے کہ اسلام تو بس ٹھنڈے ٹھنڈے وعظ اور اچھے اخلاق کے نتیجے میں پھیلا' اس کے لیے کسی نے خون کی قربانی نہیں دی۔ ایسا فکر یا تو قرآن اور سیرتِ مطہرہ سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہے یا حقیقت کو قصداً و عمداً چھپانے کی ایک کوشش ہے۔ یہ بدر' اُحد' حنین' خیبر' احزاب وتبوک اور دیگر درجنوں غزوات وسرایا کس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں؟ اصل حقیقت جو سیرت النبی ﷺ سے ظاہر ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے دعوت الی اللہ کے ذریعے لوگوں کو اکٹھا کیا' اُن کے دلوں میں قرآنی آیات کے ذریعے ایمان کو راسخ کر دیا' ان کی تنظیم وتربیت فرمادی اور پہلے مدینہ منورہ اور پھر جزیرۃ العرب کے ایک معلوم حصے پر بہ نفس نفیس اللہ کی حکومت قائم کی۔ یہی حزب اللہ کی حکومت تھی اور یہی خلافت تھی جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ اور رسول کے فرمودات کے مطابق رواں دواں ہوگئی۔ چونکہ یہ اللہ کی حکومت تھی لہٰذا اسے ہی حق حاصل تھا کہ اسے مان لیا جائے' اس کی بیعت کی جائے' اسی کی اطاعت کی جائے اور اسی کی بالادستی تسلیم کی جائے۔ اب جو بھی قوت اس خدائی نظام (خلافت) کے خلاف اٹھنے یا مزاحم ہونے کے جرم کی مرتکب ہوئی تو اسے اسی وقت ہی چیلنج کیا گیا' اُسے چھیڑا گیا جیسے کہ جنگ بدر سے پہلے کے واقعات ہوئے۔ ابوسفیان کے قافلہ کی راہ کو مخدوش کیا گیا' واقعہ نخلہ میں قریشی کو مارا گیا۔ گویا پرسکون جھیل میں پتھر پھینک کر تلاطم برپا کیا گیا۔ یہی تو وہ بات تھی کہ حضور ﷺ اب اللہ کے گھر میں شرک وگمراہی کو مزید ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے۔ چنانچہ آپؐ ہی نے پہل کی'

اقدام فرمایا اور باطل سے ٹکر لے لی۔ لہٰذا یہ معذرت خواہانہ سوچ غلط ہے کہ اسلام صرف وعظ وتبلیغ کے ذریعے پھیلا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام کے غلبہ میں تعلیم وتعلّم' دعوت وتبلیغ' وعظ ونصیحت' رواداری و ہمدردی وغیرہ نے اپنی اپنی جگہ کام کیا ہے' لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بس یہی سب کچھ تھا اور اسلام کے ایک بڑے اور اہم جزء یعنی قتال فی سبیل اللہ کو ایک طرف رکھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر یہ قرآنی سورتیں' البقرۃ' آل عمران' النساء' المائدۃ' الانفال' التوبۃ' الحج' الصف' الحدید وغیرہ اور سینکڑوں متفرق آیاتِ کریمہ کس چیز سے بحث کرتی ہیں؟ اور کس کام کی ترغیب دیتی ہیں؟ یہی سیرت ہے اور آج بھی مسلمانوں کے لیے یہی منہاج ہے۔

آج کیا اور کیسے کرنا ہے؟

اس وقت کے حالات کے تقاضے کے طور پر یہ اہم ترین سوال ہے اور اس کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ختم نبوت کے منطقی نتیجہ کے طور پر کارِ رسالت کا فریضہ اب اُمت کے ذمہ ہے۔ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی آ ہی نہیں سکتا۔ اب اُمت ہی کی ذمہ داری ہے' اُمت ہی نے دعوت کے ذریعے لوگوں کو اللہ کی طرف بلا کر ایک حزبُ اللہ تشکیل دینی ہے۔ اوپر سیرت مطہرہ کے حوالے سے بیان کردہ لائحہ عمل کے ذریعے اس حزب اللہ کی تعلیم وتربیت کر کے اسے سمع وطاعت کا خوگر بنانا ہے۔ یہ جماعت جزوی نہیں بلکہ ''پورے دین'' کی دعوت دیتی رہے گی' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتی رہے گی۔ جو حق ہے اسے حق کہہ کر پکارے گی اور جو باطل ہے اسے باطل کہے گی۔ یہ جہاد باللسان جاری رہے گا۔ ان کی دعوت و پیغام کا لب لباب یہ ہوگا: ''خود اللہ کے بندے بنو' اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دیتے رہا کرو اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدّوجہد کرتے رہا کرو''۔ یعنی ایسے نظامِ اجتماعی بحال کرنے کی جدوجہد میں لگ جاؤ جس میں صرف اللہ کی کتاب اور سنت رسولؐ کی بالادستی ہو اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کل کی کل اس کے تحت ہو۔ یہ مکمل پیغام دینا ہوگا۔ اس جماعت کا ہدف بالکل واضح اور قابل فہم ہو' یعنی دعوت الی اللہ جس کا نتیجہ ہے ''عبادتِ ربّ''۔ اس سے آگے بڑھ کر شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنا ہوگا جس کا جزو لاینفک ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ جبکہ آخری اور سب سے اہم کام اقامت دین ہے۔ یعنی ترتیب یہ ہوگی: دعوت' عبادت' شہادت اور اقامت۔ اس سے کمتر کوئی بھی چیز دین کا جامع تصور شمار نہیں ہو سکے گی۔ یہود کے رویہ کے متعلق قرآنی آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

﴿...... اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''...... تو کیا مانتے ہو بعض کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو؟ سو کوئی سزا نہیں اس کی جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں' اور قیامت کے دن پہنچا دیے جائیں سخت سے سخت عذاب میں' اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔''

چونکہ آج ہمیں ایک مسلمان معاشرہ میں کام کرنا ہے اور مسلمانوں ہی کو دین کا جامع تصور دینا ہے' لہٰذا اس کام کے لیے کسی قسم کی تشدد کی راہ اختیار نہیں کی جاسکتی۔ آپ کسی بھی کلمہ گو کے خلاف تلوار یا بندوق نہیں اٹھا سکتے' آپ خونریزی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا آج آپ کے لیے یہ راستہ کھلا ہے کہ آپ منظّم ہو کر منکرات کے خلاف آواز اٹھائیں۔ کسی کی مخالفت کی پروا کیے بغیر منکرات کو باللسان ہدفِ تنقید بنانا ہوگا۔ اگر اس بات پر آپ کے اوپر کسی بھی طرف سے تشدد ہوتا ہے تو آپ کو برداشت کرنا ہوگا' لیکن اپنی حق بات سے آپ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ حرام کو حرام اور باطل کو باطل کہنا ہوگا۔ اللہ کی حدود کی پامالی کی طرف عوام' خواص اور حکومت وقت کی توجہ مبذول کروانا ہوگی۔ ہر ظلم' استحصال' ناانصافی' بے حیائی' فحاشی' سودی کاروبار غرض ہر حرام اور غلط کام کے خلاف منظّم طریقے سے آواز اٹھانی ہوگی' اس کے مرتکبین خواہ عوام ہوں' خواص ہوں' سیاست دان ہوں' حکومت ہو یا کوئی اور —— یہی کام کرنا ہے جو دین کے جامع تصور کے حوالے سے دینی فریضہ ہے۔

خلاصۂ مضمون (جامع تصوّرِ دین اور فریضۂ دینی)

(۱) اسلام صرف مذہب ہی نہیں' بلکہ ایک مکمل دین ہے' جس میں عقیدۂ توحید' عبادات' رسومات' معاشرت' معاشیات اور سیاسیات یعنی تمام انفرادی اور اجتماعی شعبہ جات شامل ہیں۔ اس کا ایک مکمل اجتماعی نظام ہے۔

(۲) اسلام بحیثیت دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ جب یہ غالب حیثیت میں نہ ہو تو یہ سکڑ کر صرف مذہب کی حیثیت سے رہ جاتا ہے (جیسا کہ آج کل ہے)۔

(۳) حضور نبی اکرم ﷺ کا ایک مشن تو وہ تھا جو تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اس کے خالق کے ساتھ جوڑنا۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کی بحیثیت آخری پیغمبر ایک

امتیازی شان یہ ہے کہ آپؐ کو غلبۂ دین یا اظہارِ دین الحق کا مشن تفویض کر کے بھیج دیا گیا تھا (دیکھیے سورۃ التوبۃ' الفتح اور الصّف)۔ ۲۳ سالہ محنت شاقہ کے بعد آپؐ نے اس دین کو دنیا کے ایک حصہ پر غالب کر کے ایک نمونہ (ماڈل) کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

(۴) دین کا اصل یہ ہے کہ یہ عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے ایک جامع تصور دیتا ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تینوں کام بطور فریضۂ دین بلاکم وکاست کرنے ہیں: ﴿اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪﴾ (البقرۃ:۲۰۸) اور یہی عمل صالح کا جامع عنوان ہے۔

(۵) آج دنیا میں اُمتِ مسلمہ سلامت نہیں رہی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اُمت ''قومی ریاستوں'' میں منقسم ہو چکی ہے۔ خود فراموشی' بے عملی اور اغیار کی سازشوں نے مسلمان اُمت کو تقسیم در تقسیم کے ذریعے فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہر قومی ریاست کے اندر مسلمان پھر مزید نسل' زبان' جغرافیہ اور مسلکوں کی بنیاد پر تقسیم ہو چکے ہیں۔ یہی کل اسلامی ممالک اور خصوصاً پاکستان کا المیہ ہے۔ اب اُمت کو دوبارہ جوڑنے کی بنیاد صرف ایک ہی ہے' یعنی کتاب اللہ اور سنت رسولؐ۔ اس کے لیے جدوجہد کرنا اصل جہاد ہے: بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ۔

(۶) پاکستانی مسلمانوں نے تو حصولِ پاکستان کی جدّوجہد کے دوران اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کو تیسری مرتبہ تازہ کر کے وعدہ کیا تھا کہ اے اللہ! تو ہمیں ایک خطۂ زمین دے کر آزادی سے ہمکنار فرما تو ہم تیری بندگی پر مبنی نظامِ عدل وقسط قائم کر کے پاکستان کو اسلامی نظام کا ایک ماڈل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اس وعدہ کا ایفا کرنا ابھی باقی ہے اور یہ ہمارے ذمے ہے۔

(۷) فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے لیے منہج اور طریق کار وہی بروئے کار لانا ہوگا جس کے ذریعے حضور نبی اکرم ﷺ نے وہ عظیم انقلاب برپا کیا تھا جو تاریخ انسانی میں صرف ایک دفعہ آپؐ کے دستِ مبارک کے ذریعے برپا ہو چکا ہے اور جو انہی خطوط پر قیامت سے پہلے ایک دفعہ پھر ہونا ہے' جس کے لیے قرآن حکیم میں واضح اشارات اور الصادق والمصدوق ﷺ کی متعدد احادیث موجود ہیں۔ اس منہاج کے سنگ ہائے میل یہ ہیں: نظریۂ توحید' اس کی دعوت کے نتیجہ میں ایک جماعت کی تشکیل' جماعت کی تربیت وتزکیہ' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ اور دعوت بالقرآن —— اس کے نتیجہ میں مزاحمت ہو گی' مخالفت ہو گی' زبانی بھی اور عملی بھی' تاہم ان سب مشکلات پر صبر کے مراحل طے

کرنے ہوں گے۔ اس جماعت کی عددی قوت‘ ایمان کی مضبوطی اور اپنے مقصد کے ساتھ پختہ وابستگی ہی وہ قوت فراہم کرے گی جس کے نتیجہ میں ان منکرات کو بالفعل چیلنج کرنا ممکن ہو سکے گا۔

(۸) نتیجتاً اگر اللہ کا دین غالب ہو جائے‘ جو لامحالہ دنیا کی کسی جغرافیائی حدود کے اندر ہی ہوگا‘ تو اب یہ باضابطہ ’’خلافت‘‘ کی شکل اختیار کرے گا۔ یہاں پر عدل و قسط‘ اخوت و مساوات کا ایک ماڈل دنیا کے سامنے آ جائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے دنیا ترستی ہے۔ انسان کا مسئلہ نہ جمہوریت نے حل کیا ہے نہ کیپٹلزم نے اور نہ ہی سوشلزم اور کمیونزم نے — یہی متاعِ گم گشتہ ہے جسے اس اُمت نے دوبارہ بحال کرنا ہے — اس کے لیے جدّوجُہد وہی لوگ کریں گے جو خود عبادتِ ربّ کے لیے کمربستہ ہو چکے ہوں۔

(۹) اس ’’خلافت‘‘ یا اللہ کی حکومت کا یہ حق ہے کہ یہ پھلے پھولے اور دوسرے تمام ’’ادیان‘‘ پر غالب ہو۔ اس کے آگے اگر کوئی طاقت رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہو‘ اور اس کے خلاف سازشیں کر رہی ہو تو اس حزب اللہ کو اس کے خلاف اقدام کرنا ہوگا‘ جو جہاد کی آخری منزل یعنی قرآنی اصطلاح میں ’’قتال فی سبیل اللہ‘‘ بن جاتی ہے (شریعت میں اس کی اپنی شرائط ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ہوگا)۔

(۱۰) یہی خلافت ہے جو دنیا کو چیلنج کر سکے گی کہ آپ ایمان لائیں تو ہمارے بھائی بن جاؤ گے۔ نہیں تو جزیہ قبول کر کے امن کے ساتھ اللہ کی خلافت کی چھتری کے نیچے مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی گزارو۔ تمہارے حقوق کی کل ذمّہ داری اسلامی خلافت پر ہوگی۔ یہ قبول نہیں تو ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ تلوار سے ہوگا (ذرا سوچیں کیا آج اُمّت مسلمہ اس پوزیشن میں ہے؟)

یہ مختصر تشریح ہے اس تصور کی جس میں اسلام کو بحیثیت دین مانا گیا ہے۔ اس کے مطابق ہر مسلمان نے اپنی زندگی کا رخ متعیّن کرنا ہے۔ یہی ایمان و عمل صالح کا حاصل ہے — یہ ہماری دینی ذمّہ داریاں ہیں جو ہمیں اپنے اصل مقصد (نجاتِ اُخروی اور رضائے الٰہی) کے حصول کے لیے ہمارے اوپر عائد کی گئی ہیں — اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ اس کے حوالے سے اپنے فرائض کو عزم و اخلاص کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے کمربستہ ہوں۔ آمین یاربّ العالمین!

اُسوہ و سیرتِ رسول اکرم ﷺ

پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند تالیفات

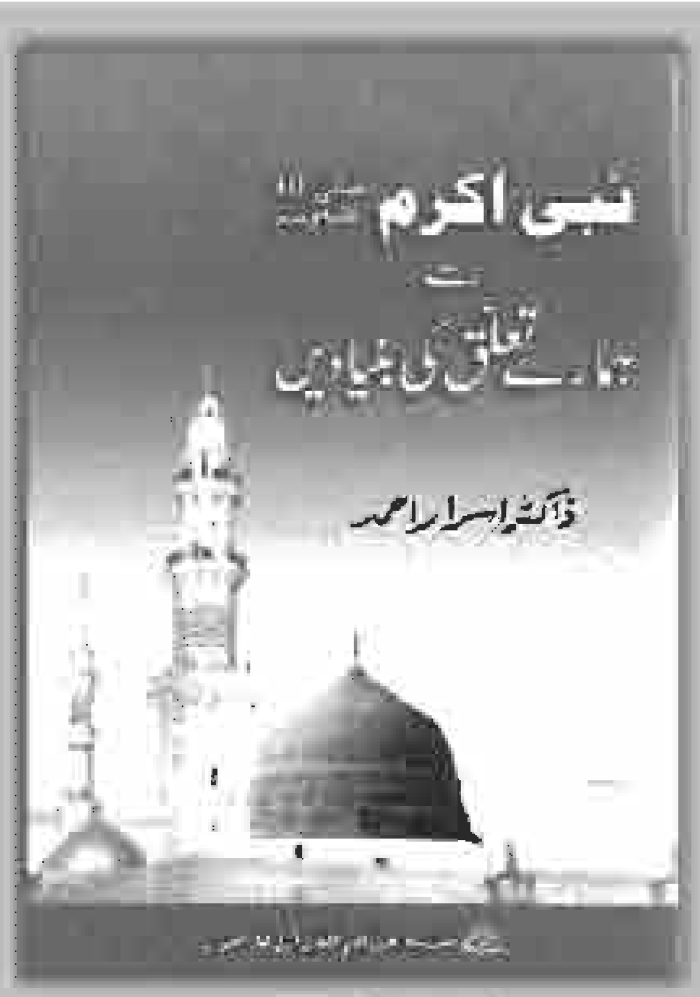

اشاعت خاص: 35 روپے
اشاعت عام: 20 روپے

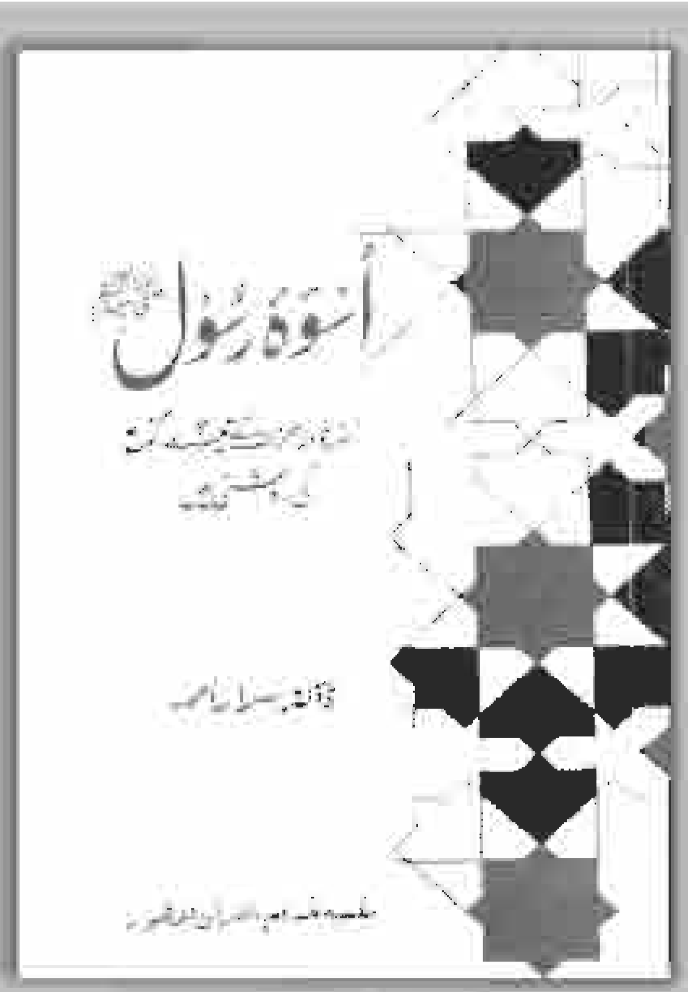

اشاعت خاص: 50 روپے
اشاعت عام: 30 روپے

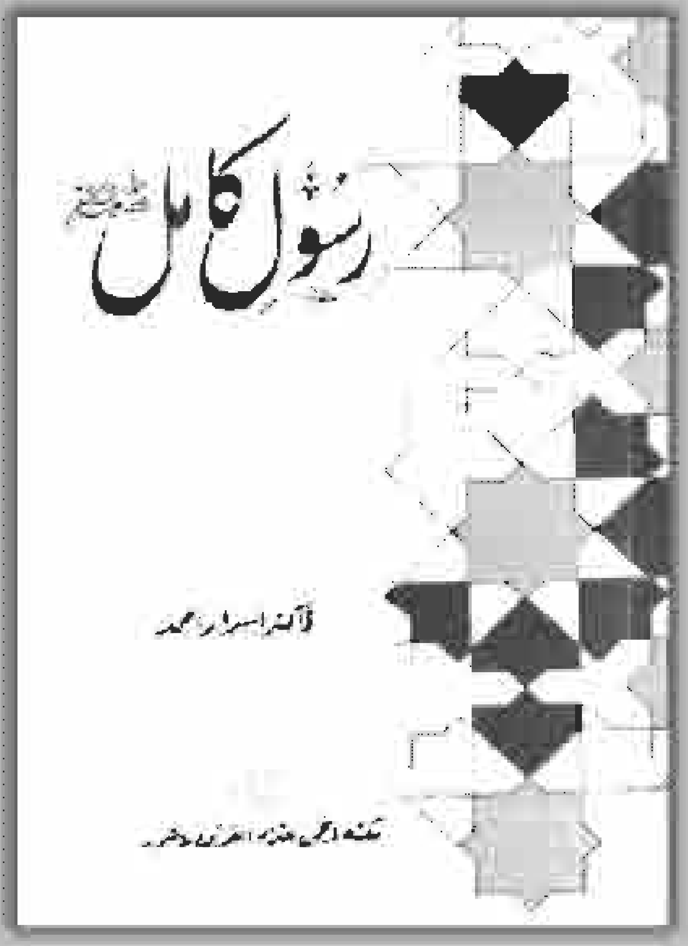

اشاعت خاص: 45 روپے
اشاعت عام: 25 روپے

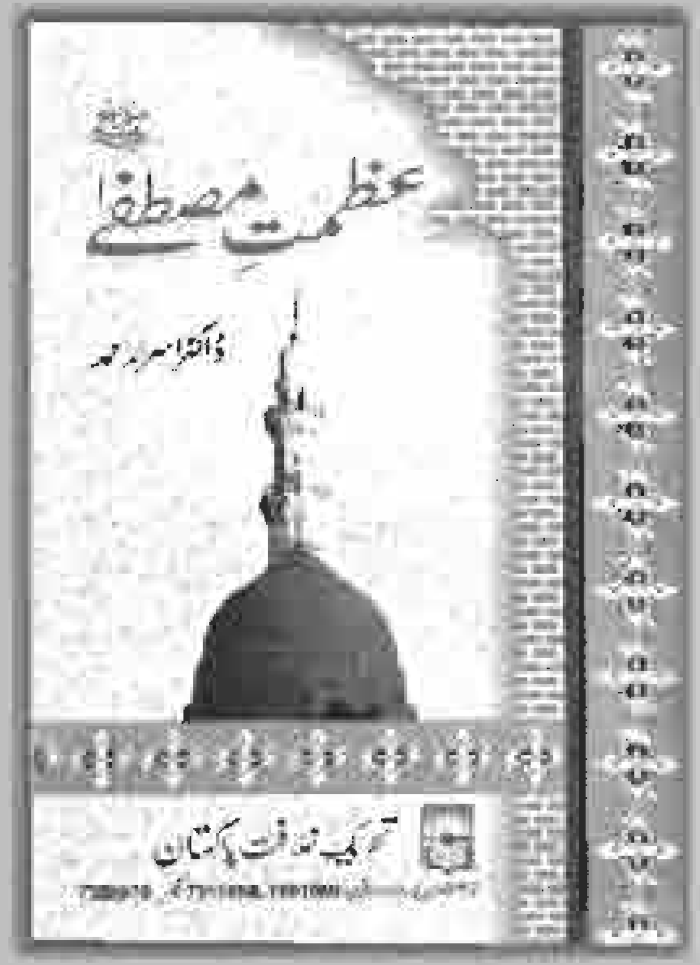

اشاعت خاص: 40 روپے

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی‘ K-36 ماڈل ٹاؤن‘ لاہور فون: +92-42-35869501-3
ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

رسولِ اکرم ﷺ — نبیِّ رحمت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رسول اللہ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ آپ کی زندگی رأفت ورحمت‘ شفقت اور محبت کی زندگی تھی۔ رحیم وکریم ہونا انسانیت کی معراج ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسانی رویّے کو حیوانی رویّے سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے جاندار اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں مگر انسان میں رحمت ورأفت کی صفت اسے دوسرے تمام ہم جنسوں بلکہ تمام مخلوق کے ساتھ بھلائی اور ہمدردی کی تعلیم دیتی ہے۔

ویسے تو ہر انسان کا مزاج فطری ہوتا ہے‘ یعنی کوئی شخص فطرتاً نرم مزاج ہوتا ہے اور کوئی سخت مزاج‘ مگر پسندیدہ رویہ رأفت اور نرمی کا ہے۔ اگر کسی شخص کو بس اپنے فطری مزاج کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہوتی تو انبیاء ورسل کی بعثت کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً انبیاء بھیجے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے انسان کے مزاج میں اعتدال کی تعلیم دی۔ نرمی کو اس طرح کنٹرول کیا کہ بے حمیتی اور بے غیرتی تک نہ چلی جائے اور درشت مزاجی کو اس حد تک نہ جانے دیا کہ دوسروں کے حقوق تلف ہوتے رہیں۔

رسول اللہ ﷺ نہ صرف انسانوں بلکہ اللہ کی تمام مخلوق سے رتبے میں بلند وبرتر ہیں۔ آپؐ کے اندر تمام اخلاقی خوبیاں درجۂ کمال تک موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپؐ کی شان میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴﴾ (القلم) ”بے شک آپؐ بلند اخلاق کے مالک ہیں“۔ پھر خود آپؐ نے احقاقِ حق اور تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ))(۱) ”مجھے تو تمام اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے“۔ چنانچہ آپؐ کے رویّے میں مخلوقِ خدا کے حق میں اس قدر رحمت ورأفت تھی کہ قرآن مجید میں آپؐ کو رحمۃ للعالمین (جہانوں کے لیے رحمت) کے لقب سے نوازا گیا۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ مشرکین کے لیے بددعا کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے بہت لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا‘ مجھے تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے(۲) چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مرد وعورت‘ بچے بوڑھے‘ امیر غریب‘ اپنے پرائے‘ عربی عجمی پر بلاتفریق مہربانی فرماتے تھے۔ سب کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرتے۔

حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا تھا‘ نہ کسی عورت کو نہ کسی خادم کو‘ سوائے اس کے کہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے‘ اور آپؐ کو جب کبھی کسی سے تکلیف پہنچی آپؐ نے کبھی بھی بدلہ نہ لیا۔ ہاں اگر اللہ کے حرام ٹھہرائے ہوئے کاموں میں سے کوئی کام کیا جاتا تو آپؐ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس حرام فعل کا ارتکاب کرنے والے سے انتقام لیتے(۳)

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی تھا کہ آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں‘ ان کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کریں اور ان کو اللہ کا پیغام پہنچائیں تاکہ وہ اس پر عمل کر کے موت کے بعد کی ابدی زندگی سنوار لیں۔ قرآن مجید میں آپ کو حکمِ خداوندی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:۶۷) ”اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے جو پیغام آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں‘ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا حقِ رسالت ادا نہ کیا“۔ چنانچہ آپؐ نے حکم خداوندی پر عمل کرنے کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا بلکہ پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی تاکہ وہ ابدی سکھ حاصل کر سکیں اور دوزخ کی آگ سے بچ سکیں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ میری اور لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ سلگائی۔ پھر جب اس آگ نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو پتنگے اور آگ میں گرنے والے کیڑے اس آگ میں گرنے لگے۔ وہ شخص انہیں کھینچ کھینچ کر باہر نکالنے لگا مگر وہ اس پر غالب آنے لگے اور اس آگ میں گرتے رہے۔ پس (وہی حال میرا اور تمہارا ہے کہ) میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمہیں آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ اس میں گرے جا رہے ہو(۴)

یہ حقیقی انسانی ہمدردی ہی تھی جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے حد درجہ سختیاں برداشت

کیں مگر کسی وقت بھی کُفّار اور مشرکین کو چھوڑ کر الگ نہ ہوئے' بلکہ جان کے دشمنوں سے بھی اس قدر ہمدردی کی کہ ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کرتے رہے اور تکالیف اٹھاتے رہے۔ آپ ﷺ نے دوست اور دشمن سب کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا اور کسی مخالف کی حد درجہ مخالفت سے خفا ہو کر اُس کے حق میں بددعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ طفیل بن عمر دوسی اور ان کے ساتھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! دَوس کے لوگوں نے نافرمانی کی پس آپ ان کے لیے اللہ سے بددعا کریں۔ اس پر لوگ کہنے لگے اب قبیلہ دوس ہلاک ہو جائے گا (کیونکہ حضور ﷺ نے بددعا کر دی تو وہ ضرور قبول ہو جائے گی) مگر حضور ﷺ نے (ان کے لیے بددعا نہ کی بلکہ یہ) دعا کی کہ اے اللہ! دوس والوں کو ہدایت دے اور انہیں (اسلام میں) لے آ(۵)

رسول اللہ ﷺ کو دنیا کے ہر انسان کے ساتھ ہمدردی تھی۔ جو آپ کے ساتھی بن گئے' ان کے ساتھ تو آپ کی اُلفت دیدنی تھی' مگر کافروں' مشرکوں اور منافقوں کے ساتھ بھی آپ کا رویہ اخلاق کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ آپ کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ کیونکہ ان کو نظر آتا تھا کہ اس قدر اونچے اخلاق کا حامل عام انسان نہیں ہو سکتا۔ عبداللہ بن اُبی آپ ﷺ کے وقت کا منافق اعظم تھا۔ یہی وہ شخص ہے جو غزوہ اُحد کے موقع پر اپنے تین سو ساتھیوں کو ساتھ لے کر واپس ہو گیا' گویا اسلامی لشکر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ عبداللہ بن اُبی کا بیٹا عبداللہ ؓ رسول اللہ ﷺ کا جاں نثار صحابی تھا۔ عبداللہ بن اُبی کی موت پر آپ کا حسنِ سلوک ملاحظہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ جب عبداللہ بن اُبی نے وفات پائی تو اس کے بیٹے عبداللہ ؓ آپ کی خدمت میں آئے۔ حضور ﷺ نے انہیں اپنی قمیص دی اور فرمایا کہ عبداللہ بن اُبی کو اس میں دفن کیا جائے۔ پھر آپ اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر حضرت عمر ؓ نے آپ کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے! حالانکہ وہ منافق تھا اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے استغفار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے تم ان لوگوں کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو (برابر ہے) اگر تم ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرو گے تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ (التوبہ:۸۰) یہ آیت پڑھ کر آپ نے فرمایا کہ میں اس کے لیے ستر بار سے زیادہ استغفار کر لوں گا۔ پھر آپ

نے اس کی نماز جنازہ پڑھی اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ پڑھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ حکم نازل فرمایا کہ آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا' کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ اس حال میں مرے ہیں کہ وہ فاسق تھے(۶) (سورۃ التوبہ:۸۴)

رسول اللہ ﷺ ہر ماہرِ نفسیات سے زیادہ انسانوں کی نفسیات سے آگاہ تھے۔ آپ لوگوں کی ضروریات اور حاجات کو سمجھتے تھے لہٰذا کسی آدمی پر اُس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری نہ ڈالتے' البتہ دوسروں کے حقوق درجہ بدرجہ ادا کرنے کی تلقین کرتے۔ ماں باپ' رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص طور پر ہدایت فرماتے۔ حضرت مالک بن حویرث ؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم کچھ ہم عمر نوجوان رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور بیس راتیں آپ کے پاس ٹھہرے۔ پھر آپ نے محسوس کیا کہ ہم (اداس ہیں اور) اپنے گھر والوں کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ پس آپ نے ہم سے پوچھا کہ تم کن کن اہل خانہ کو پیچھے چھوڑ آئے ہو تو ہم نے آپ کو بتایا۔ آپ بڑے نرم مزاج اور رحم دل تھے۔ آپ نے فرمایا: (اچھا) تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس جاؤ اور جا کر انہیں تعلیم دو۔ انہیں نیک کام کرنے کا حکم دو اور نماز پڑھو جیسے کہ تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب نماز کا وقت آ جائے تو تم میں سے ایک تمہارے لیے اذان دے اور جو تم میں سے سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرائے(۷)

حضور اکرم ﷺ کو اپنی اُمت کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اُمت کا کوئی فرد بھی آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہونے پائے اور کسی نہ کسی طرح اس کی بخشش ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کی ایک (مقبول) دعا ہوتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر اللہ کو منظور ہو تو میں اپنی (اس مقبول) دعا کو قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کرنے کے لیے محفوظ رکھوں(۸) رسول اللہ ﷺ نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۸ کی تلاوت کی۔ اس آیت میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ قیامت کے دن اپنی اُمت کی سفارش کرتے ہوئے اللہ کے حضور عرض کریں گے: ''(اے اللہ) اگر آپ انہیں سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف فرما دیں تو آپ غالب اور حکیم ہیں''۔ یہ آیت پڑھ کر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا اَللّٰھُمَّ اُمَّتِیْ ، اُمَّتِیْ اور آپ رونے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ اور تمہارا

رب خوب جانتا ہے تاہم ان سے پوچھو کہ آپ کس بات پر روتے ہیں؟ پس جبریلؑ آپؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے (رونے کا سبب) پوچھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کہا تھا وہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو بتا دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ خود خوب جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ اور (اُن سے) کہو کہ ہم آپ کو آپ کی اُمت کے بارے میں خوش کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہیں کریں گے۔(۹)

قرض لینا آپ پسند نہیں کرتے تھے۔ تاہم دنیاوی ضروریات کے تحت قرض لینا پڑ جاتا ہے اور اس کی اجازت بھی ہے' مگر اس بات کی سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے کہ مقروض قرض کی ادائیگی میں مقدور بھر جلدی کرے تاکہ موت کے وقت اُس پر قرضے کا بار نہ ہو۔ قرض کی ادائیگی اس قدر ضروری ہے کہ شہید پر بھی اگر قرض کا بوجھ ہوگا تو اس کی ادائیگی تک وہ جنت میں نہ جاسکے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی ایسی میت لائی جاتی جس پر قرض ہوتا تو آپؐ دریافت فرماتے کہ کیا اس شخص نے اپنے قرض کے لیے فالتو مال چھوڑا ہے؟ اگر آپ کو بتایا جاتا کہ اس نے اتنا مال چھوڑا ہے جس سے اس کا پورا قرض ادا ہو جائے گا تو حضور ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیتے' ورنہ مسلمانوں سے فرماتے کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اموالِ غنیمت کھول دیے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں مؤمنوں کا خود ان کی ذات سے بھی زیادہ خیر خواہ ہوں۔ پس مؤمنوں میں سے جو کوئی وفات پا جائے اور قرض چھوڑے تو اس قرض کو ادا کرنا میرے ذمّہ ہے اور جو کوئی مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے۔(۱۰) یوں اُمت کے زیر بار افراد کے ساتھ آپ کی ہمدردی واضح ہے۔

بچوں' بڑوں' خدمت گزاروں' زیر دستوں' عورتوں الغرض سب کے ساتھ آپؐ رحم دل اور محبت کرنے والے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرنا آپؐ کے ہاں نہ تھا' بلکہ آپؐ قصوروں کی معافی پر فراخ دل تھے۔ منافق جھوٹے بہانے بنا کر آپؐ سے مراعات حاصل کر لیتے مگر آپؐ درگزر فرماتے اور سختی کا برتاؤ نہ کرتے۔ زیر دستوں اور بچوں پر تو آپ کی شفقت دیدنی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پاس کوئی خادم نہ تھا' (میرے سوتیلے باپ) حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! انس ایک سمجھدار لڑکا ہے' یہ

آپ کی خدمت میں رہے گا۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ پھر میں نے سفر اور حضر میں حضور ﷺ کی خدمت کی (حضورؐ اس قدر نرم مزاج اور شفیق تھے کہ) اگر میں نے کوئی کام کیا تو آپؐ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام اس طرح کیوں کیا؟ اور اگر میں نے کوئی کام نہ کیا تو آپؐ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام اس طرح کیوں نہیں کیا؟(۱۱)

حضرت رافع بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کے کھجور کے درختوں پر ڈھیلے مارا کرتا تھا۔ لوگوں نے مجھے پکڑا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے رافع! تم ان کے کھجور کے درختوں پر ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ بھوک (کے باعث)۔ آپؐ نے فرمایا: ڈھیلے نہ مارا کرو۔ جو (کھجور) خود ہی گر جائے وہ کھا لیا کرو۔ اللہ تمہارا پیٹ بھرے اور تمہیں سیراب کرے۔(۱۲)

رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر مرد بھی بیعت کرتے تھے اور عورتیں بھی۔ عورتوں سے بیعت لیتے وقت آپؐ ان سے ہاتھ نہیں ملاتے تھے بلکہ زبان سے فرما دیتے کہ میں نے تم سے بیعت کر لی۔ حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں انصار کی کچھ عورتوں کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تاکہ ہم آپؐ سے بیعت کریں۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم آپؐ سے بیعت کرتی ہیں اس پر کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی' اور چوری نہیں کریں گی' اور بدکاری نہیں کریں گی' اور کوئی بہتان نہیں لگائیں گی جسے ہم نے اپنے ہاتھ پاؤں کے سامنے گھڑا ہو اور کسی نیکی کے معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی (ہماری یہ بات سن کر) حضورؐ نے فرمایا: (ان کاموں کا وعدہ کرتے ہوئے ساتھ یہ بھی کہو کہ) جہاں تک ہم سے ہو سکے گا اور جہاں تک ہم میں طاقت ہوگی۔ حضرت امیمہؓ کہتی ہیں کہ (آپؐ کی یہ ہمدردانہ بات سن کر) ہم بول اٹھیں کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہم پر بہت مہربان ہیں۔(۱۳) گویا آپؐ نے خود عورتوں کو یاد دلایا کہ حسبِ استطاعت کے الفاظ بھی کہو کیونکہ کون ہے جو بیعت کے ان الفاظ پر کما حقّہ عمل کر سکتا ہو! جب بندے نے حسبِ استطاعت کے الفاظ کہہ دیے تو گویا اُس نے اللہ کے حضور اپنی بے بسی اور کمزوری کا اظہار کر دیا جو کہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور یہ بات خود رسول اللہ ﷺ خواتین کو یاد دلا رہے ہیں۔ دیکھئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ فرمایا ہے۔ (سورۃ التوبہ: ۱۲۸)

عبادت کے معاملے میں بھی آپؐ اعتدال اور نرمی پسند کرتے تھے۔ تلاوت قرآن کے

بارے میں آپ کی ہدایت ہے کہ جس وقت تک طبیعت میں چاہت اور آمادگی ہو اس وقت تک تلاوت کرتے رہو‘ جب کسل پیدا ہونے لگے یا نیند کا غلبہ ہو جائے یا تکان محسوس ہونے لگے تو تلاوت موقوف کر دو۔ اسی طرح نماز میں بھی قابل برداشت مشقت اٹھائی جائے۔ آپؐ نے نماز پڑھانے والوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ لوگوں کو ہلکی نماز پڑھائیں جو نمازیوں کے لیے سہولت کا باعث ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اسے ہلکی نماز پڑھنی چاہیے‘ کیونکہ نمازیوں میں کمزور‘ بیمار اور بوڑھے (سبھی طرح کے لوگ) ہوتے ہیں۔ ہاں جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی پڑھے۔[۱۴]

رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے ہوتے اور خواتین بھی جماعت میں شامل ہوتیں تو بچوں والی خواتین کی خاطر آپؐ قراءت مختصر کر دیتے۔ حضرت ابوقتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اسے لمبا کروں مگر پھر کسی کے بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کر لیتا ہوں‘ کیونکہ مجھے یہ پسند نہیں کہ (میں لمبی قراءت کر کے) اُس کی ماں کے لیے تکلیف کا باعث بنوں۔[۱۵]

رسول اللہ ﷺ کی تواضع اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ ہر کوئی آپؐ سے بے تکلف بات کر لیتا اور اپنا مسئلہ بیان کر کے آپ سے تعاون حاصل کر لیتا‘ کیونکہ لوگ آپؐ کی نرمی اور رأفت سے واقف تھے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا۔ وہ (آپؐ کے پاس آ کر) کہنے لگی: یارسول اللہ! مجھے آپؐ سے کوئی کام ہے (وہ عورت اپنی بات صحابہ کرامؓ کے سامنے نہ بتانا چاہتی تھی) آپؐ نے اس سے فرمایا: اے ام فلاں جو گلی چاہے دیکھ لو (اور وہاں مجھے اپنا کام بتا دو) میں تمہارا کام کر دوں گا۔ پس آپؐ کسی راستے میں اسے تنہا ملے یہاں تک کہ اس کا کام ہو گیا[۱۶] آپؐ نے اس کی بات بھی اُس کی خواہش کے مطابق سن لی اور حل بھی بتا دیا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے حق میں انتہائی مہربان‘ رؤف و رحیم بلکہ فکر مند تھے۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ میری اُمت نافرمانی والے کام نہ کرے اور اُمت کا کوئی فرد بشر آخرت کے عذاب کا نشانہ نہ بنے۔

انسان تو انسان‘ آپؐ کسی جانور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جانوروں کے بارے میں بھی آپؐ نے ہدایات دی ہیں کہ اُن کے کھانے پینے کا پورا دھیان رکھا جائے۔ ان

پر اتنا بوجھ لادا جائے جسے وہ برداشت کر سکیں اور ان کی تکلیف کا باعث نہ ہو۔ جانوروں سے اتنا کام نہ لیا جائے کہ وہ نڈھال ہو جائیں۔ جن جانوروں سے کام لیا جائے ان کے آرام کا بھی خیال رکھا جائے۔ جانوروں کے گھروں کو نہ جلایا جائے اور پرندوں کے بچے گھونسلوں سے نہ اٹھائے جائیں۔ جانوروں کو باہم لڑایا نہ جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عبداللہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپؐ رفع حاجت کے لیے گئے تو ہم نے سرخ سر والی ایک چڑیا دیکھی جس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے اس کے بچے لے لیے۔ پھر چڑیا آ گئی اور زمین پر بازو بچھانے لگی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ آ گئے۔ آپؐ نے دیکھا تو فرمایا کہ کس نے اس کا بچہ لے کر اسے دکھ پہنچایا ہے؟ اس کا بچہ اسے لوٹا دو۔ پھر آپؐ نے چیونٹیوں کا ایک سوراخ دیکھا جسے ہم نے جلا دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: اسے کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا ہم نے جلایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: آگ سے عذاب دینا کسی کو درست نہیں سوائے آگ کے مالک (یعنی اللہ) کے۔[۱۷]

ایک دن رسول اللہ ﷺ کسی انصاری کے باغ میں گئے تو وہاں ایک اونٹ آ گیا۔ اس نے حضور ﷺ کو دیکھ کر درد بھری آواز نکالی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضور ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے کانوں کی جڑوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہو گیا۔ آپؐ نے پوچھا یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری جوان نے عرض کیا یارسول اللہ میرا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تو اس جانور کے بارے میں اللہ سے ڈرتا نہیں جس کا اللہ نے تمہیں مالک بنایا ہے۔ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تو اسے بھوکا رکھتا ہے اور (زیادہ کام لے کر) اسے تھکاتا ہے۔[۱۸]

الغرض رحم دلی اور ہمدردی اخلاقیات کی نمایاں صفات ہیں۔ ہر اچھے انسان میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے اچھا ہونے کے لیے دیکھا جائے گا کہ اس کے دل میں دوسروں کا درد کس قدر ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں!

اللہ کے احکام کی کما حقہٗ اطاعت تو اللہ کے مقرب فرشتے کر بھی رہے تھے۔ انسان کو تخلیق کیا گیا کہ دیکھیں وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ انسانیت کے گل سر سبد تھے اس لیے آپؐ میں رحم دلی اور ہمدردی کی صفات درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں‘

جن کی چند مثالیں آپ نے اوپر دیکھیں۔

البتہ یہ بات بھی ذہن میں متحضر رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی کی بھی حدود و قیود تھیں۔ آپؐ نے جان کے دشمنوں پر بھی رحم کیا' اُن سے کسی طرح کا انتقام نہ لیا' مگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں کسی طرح کی رعایت نہ کی۔ جب کفار صف بستہ ہو کر مسلمانوں کو ختم کرنے اور اسلام کو مٹانے کے لیے میدان میں آتے تو پھر اُن کے ساتھ کسی طرح کی نرمی نہ کی جاتی اور ایسا کرنا اللہ کے حکم کی تعمیل تھی' کیونکہ اللہ کے دین کو مٹانے کی جدّوجہد کرنے والوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نبٹنے کا حکم تو اللہ نے دے رکھا تھا' لہٰذا اس کو تو کسی طور چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ (التوبۃ:۷۳)

''اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔''

پس حربی کافر ہر طرح کا رحم اور ہمدردی کھو بیٹھتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے مدّ مقابل آ کر سختی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان پر رحم کرنا خود اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبۃ:۱۲۳)

''اے اہلِ ایمان! لڑائی کرو اپنے نزدیک کے کافروں سے اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔''

یعنی جنگ کے وقت دشمنانِ اسلام کے ساتھ اس طرح بے جگری سے لڑو کہ ان پر تمہاری جرأت' بہادری' جاں نثاری اور مقصدیت واضح ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے کفر کے مقابلے میں جرأت اور بہادری کے وہ کارنامے دکھائے کہ تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح اسلامی معاشرے میں جس شخص پر جرم ثابت ہو جائے اس پر اللہ کے حکم کے مطابق سزا دیتے وقت بھی کسی طرح کا رحم کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ اللہ کے حکم کی تنفیذ میں کسی طرح کی مداہنت کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ

بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (النور:۲)

''زانی مرد اور زانی عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو درّے مارو' اور اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کی تنفیذ میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔''

اسی طرح چور مرد ہو یا عورت اُس کی سزا یہ ہے کہ اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے (دیکھئے سورۃ المائدۃ آیت ۳۸)۔ ظاہر ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹتے وقت اگر رحم دلی در آئے تو یہ سزا نافذ نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے صفت رحمت کے ساتھ حد درجہ متّصف ہونے کے باوجود ان سخت سزاؤں پر عمل درآمد کیا اور کفار کے ساتھ جب وہ مقابلے پر آئے تو کسی قسم کی رعایت نہ کی بلکہ پوری قوت سے ان کے ساتھ قتال کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی ہر اُس فرد بشر کے لیے تھی جو امن پسند ہو اور اسلام کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو۔ چنانچہ امن پسند کافروں کے ساتھ بھی آپ کا رویہ رحم دلانہ تھا۔ اسلام کا یہ واضح حکم ہے کہ اسلامی سلطنت کی غیر مسلم رعایا کو ہرگز نہ ستایا جائے بلکہ اُن کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے' جس سے غفلت برتنے کی اجازت نہیں' یہاں تک کہ کافر و مشرک اسلامی سلطنت کی رعایا ہوتے ہوئے اپنے عبادت خانے تعمیر کر سکتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق وہاں عبادت بھی کر سکتے ہیں۔

حواشی

(۱) مجمع الزوائد للهیثمی : ۹/۱۸۔ ومختصر المقاصد للزرقانی : ۱۸۴۔ سلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی : ۴۵۔

(۲) حدیث حسن صحیح' سنن الترمذی' ابواب الاستیذان والآداب' باب ما جاء فی المتشبهات بالرجال ......

(۳) صحیح مسلم' کتاب الصلاة' باب خروج النساء الی المسجد......

(۴) سنن الترمذی' ابواب الاستیذان والآداب' باب ما جاء فی طیب الرجال والنساء۔

(۵) حدیث حسن صحیح غریب' سنن الترمذی' ابواب الزهد' باب ما جاء فی اعلام الحب۔

(۶) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبی ﷺ الدین النصیحة......

(۷) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبی ﷺ الدین النصیحة......

(۸) سنن الترمذی' ابواب البر والصلة' باب ما جاء فی رحمة الصبیان۔

(۹) صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب من اخاة النبی ﷺ۔

(۱۰) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء' باب فضل الدعاء للمسلمین بظهر الغیب۔

(۱۱) حدیث حسن صحیح' سنن الترمذی' ابواب الاستیذان والآداب' باب ما جاء فی کراهیة خروج النساء متعطرة۔

باقی صفحہ 84 پر

کلامِ صدّیق رضؓ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے چند اشعار

(۱) خُذْ بِلُطْفِكَ يَا اِلٰهِىْ مَنْ لَّهٗ زَادٌ قَلِيْل
مُفْلِسٌ بِالصِّدْقِ يَاْتِىْ عِنْدَ بَابِكَ يَا جَلِيْل

''اے میرے ربّ! اپنے فضل وکرم سے اس بندہ کی دستگیری کیجیے جس کے پاس حسنات کا سرمایہ کم ہے' نیکیوں کے اعتبار سے مفلس ہے۔ اے میرے ربّ جلیل! صدق وخلوص سے وہ تیری بارگاہ میں حاضر ہو کر فریاد کر رہا ہے!''

(۲) ذَنْبُهٗ ذَنْبٌ عَظِيْمٌ فَاغْفِرِ الذَّنْبَ الْعَظِيْم
اِنَّهٗ شَخْصٌ غَرِيْبٌ مُذْنِبٌ عَبْدٌ ذَلِيْل

''اے پروردگار! یہ بندہ تیرے دربار میں حاضر ہو رہا ہے۔ اس نے بہت گناہ کیے ہیں۔ اس کے عظیم گناہوں کو معاف کر دے۔ بلاشبہ وہ عالم کس مپرسی میں ہے' بے کس ہے' خطا کار ہے' حقیر بندہ ہے!''

(۳) مِنْهُ عِصْيَانٌ وَنِسْيَانٌ وَسَهْوٌ بَعْدَ سَهْو
مِنْكَ اِحْسَانٌ وَفَضْلٌ بَعْدَ اِعْطَاءِ الْجَزِيْل

''اس خطا کار بندہ نے بہت گناہ کیے ہیں۔ تجھے وہ بھولا ہے اور بار بار بھولا ہے۔ لیکن اے پروردگار! تو نے بے پناہ بخششوں کے بعد بھی احسان کیا ہے۔ تیرے فضل وکرم کی نعمتوں نے اسے نوازا ہے!

(۴) قَالَ يَا رَبِّىْ ذُنُوْبِىْ مِثْلُ جَبَلٍ لَا تُعَد
فَاعْفُ عَنِّىْ كُلَّ ذَنْبٍ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْل

''وہ حقیر خطا کار بندہ فریاد کر رہا ہے کہ اے پروردگار! میرے گناہ پہاڑوں کی مانند بڑے ہیں' بے حساب ہیں۔ میرے ہر گناہ کو معاف کر دے اور پوری شان وکرم کے ساتھ میری خطاؤں سے درگزر فرما۔''

(۵) كَيْفَ حَالِىْ يَا اِلٰهِىْ لَيْسَ لِىْ خَيْرُ الْعَمَل
سُوْءُ اَعْمَالِىْ كَثِيْرٌ زَادُ طَاعَاتِىْ قَلِيْل

''اے میرے ربّ! میرا کیا حال ہوگا؟ میرے پاس کوئی عمل خیر نہیں ہے۔ میرے پاس برے اعمال زیادہ ہیں اور طاعت وعبادت کا سرمایہ قلیل ہے۔''

(۶) عَافِنِىْ مِنْ كُلِّ دَاءٍ وَاقْضِ عَنِّىْ حَاجَتِىْ
اِنَّ لِىْ قَلْبًا سَقِيْمًا اَنْتَ شَافِىْ لِلْعَلِيْل

''اے میرے معبود! میرا دل بیمار ہے۔ تمام روحانی بیماریوں سے میری حفاظت فرما! تو ہی بیمار کو شفا دینے والا ہے۔ روحانی صحت کی یہ میری بھی آرزو پوری کر دے۔''

(۷) اَنْتَ شَافِىْ اَنْتَ كَافِىْ فِىْ مُهِمَّاتِ الْاُمُوْر
اَنْتَ حَسْبِىْ اَنْتَ رَبِّىْ اَنْتَ لِىْ نِعْمَ الْوَكِيْل

''اے میرے پروردگار! تو شافی ہے۔ تو ہی تمام اہم اور مشکل امور میں میرے لیے کافی ہے۔ اے مالک! تیرا کرم میرے لیے کافی ہے۔ تو میرا رب ہے اور تو ہی میرا بہترین کارساز ہے۔''

یہ وجد آفریں روح پرور اشعار رفیقِ رسولؐ' یارِ غار سید الابرار سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہیں جو حضرتؓ نے وصال شریف سے دو ماہ پہلے ۲۳/ربیع الاول ۱۳ھ کو لکھے تھے۔ امام المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مدنی رحمہ اللہ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے پڑھنے سے لطافتِ روح' رقّتِ قلب اور اثر پذیری کی دولت ملتی ہے۔

(مرسلہ: محمد سلیمان قیوم' کوئٹہ)

کِذب بیانی

قرآن وحدیث کے تناظر میں

عتیق الرحمٰن صدیقی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ وَالْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ، وَاِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَالْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ، اَلَا تَرٰى اَنَّهُ يُقَالُ صَدَقَ وَبَرَّ وَكَذَبَ وَفَجَرَ (۱)

''سچائی کو اختیار کرو' کیونکہ سچائی خدا کی وفاداری کی راہ پر لے جاتی ہے اور خدا کی وفاداری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور جھوٹ سے بچو' کیونکہ جھوٹ نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی نافرمانی دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ مثل بیان کی جاتی ہے: ''اُس نے سچ کہا اور وفاداری کی' اس نے جھوٹ کہا اور نافرمانی کی۔''

جھوٹ اور اس کی اقسام

اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سچائی اختیار کرنے اور جھوٹ سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ (درحقیقت یہ مرفوع حدیث کے الفاظ ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کیے ہیں۔) اگر آپ جھوٹ نہیں بولتے تو شیطان کا آپ پر کوئی زور نہیں چلے گا' صداقت اختیار کرنے کا عزم کر لینے سے اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی کرے گا۔ جھوٹ عملی بھی ہوتا ہے اور قولی بھی۔ عملی جھوٹ یہ ہے کہ آپ دکھاوے اور ریاکاری کے لیے نماز پڑھیں' طبیعت آمادہ نہ ہو اور آپ بے دلی سے اس لیے نماز پڑھنے لگیں کہ آپ کی نیکی کی دھونس جمے۔ قولی جھوٹ یہ ہے کہ آپ کہیں کچھ اور کریں کچھ' یعنی جو کچھ آپ کی زبان پر

ہو دل میں اس کا الٹ ہو۔ تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہوں' جبکہ جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے جو اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت ہے' بلکہ تمام تر قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر کوئی آدمی صورتِ واقعہ کے علی الرغم کوئی بات کرتا ہے تو گویا وہ دوسروں کو فریب دے رہا ہے۔

جھوٹ۔ دل کی سیاہی کا موجب

امام مالک رحمہ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَتُنْكَتُ فِىْ قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ حَتّٰى يَسْوَدَّ قَلْبُهٗ كُلُّهٗ فَيُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ (۲)

''آدمی جھوٹ بولتا ہے تو ایک سیاہ نکتہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ جھوٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔''

گویا جب آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ و استغفار پر مائل ہو اور سچے دل سے گناہ سے باز آ جائے تو وہ صاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر آدمی تغافل سے کام لے اور گناہ کا مرتکب ہوتا رہے تو ایک ایک نکتے کا اضافہ ہوتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کا دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے دلوں پر مہر لگنے کی بات کی ہے۔ اس سے بھی یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ ایسے آدمی کے دل کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ نیکی کی کوئی کرن اس سے گزر نہیں پاتی۔

مؤمن اور جھوٹ

مؤمن جھوٹا نہیں ہوتا' جھوٹ اس کی فطرت سے بعید ہے۔ اعلیٰ درجے کا ایمان ہو تو اس کے اثرات نہایت قوی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کے کذاب ہونے کی نفی کی ہے' اس لیے کہ یہ خاص منافقانہ عادت ہے۔ حضرت امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ)) فَقِيْلَ لَهٗ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ)) فَقِيْلَ لَهٗ: اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا؟ فَقَالَ: ((لَا!)) (۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا مؤمن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ''ہاں''۔ پھر پوچھا گیا: کیا مؤمن بخیل ہوسکتا ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''ہاں''۔
پھر سوال کیا گیا' کیا مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''نہیں!''

معلوم ہوا کہ مؤمن میں دوسری برائیاں اور کمزوریاں ہوسکتی ہیں لیکن جھوٹ کی غلاظت سے وہ منزّہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ))(٤)

''مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔''

جھوٹ کی بدبو

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيلًا مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهِ))(٥)

''جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی جھوٹ کی بدبو سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس طرح اس مادی عالم کی مادی چیزوں میں خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اسی طرح اچھے اور بُرے اعمال اور کلمات میں بھی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے' جس کو اللہ کے فرشتے اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم یہاں کی مادی خوشبو اور بدبو کو محسوس کرتے ہیں' اور کبھی کبھی اللہ کے وہ بندے بھی اس کو محسوس کرتے ہیں جن کی روحانیت ان کی مادیت پر غالب آجاتی ہے۔'' (معارف الحدیث)

انبیاء کی ایک اہم صفت

انبیاء علیہم السلام کے خصائص میں ایک نہایت بنیادی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سچے اور صادق ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو پیغمبروں کی صفت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾﴾ (مریم) ''اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر' وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا''۔ اسی لیے کاذب کا نبی ہونا ممکن ہی نہیں ہے' کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر اعتماد ہی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اپنے آپ کو نبی کے طور پر پیش کیا تو اس نے ان کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے سے

انکار کر دیا۔ اس وقت فرعون کے ایک درباری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدقِ نبوت پر ان کی سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہوسکتا:

﴿وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿٢٨﴾﴾ (المؤمن)

''اور اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا' اور اگر سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو وہ تم کو دیتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔''

ابوسفیان اور دوسرے لوگ ہرقل (قیصرروم) کے پاس ایلیاء پہنچے' جہاں ہرقل نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا اور ابوسفیان سے حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں متعدد سوالات کیے۔ ان میں ایک سوال آپ ﷺ کی سچائی کے بارے میں بھی تھا۔ اس سوال و جواب کے بعد قیصر نے ابوسفیان سے جو فیصلہ کن الفاظ کہے وہ یہ تھے: وَسَاَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهٗ بِالْكَذِبِ قَبْلَ اَنْ يَقُوْلَ مَا قَالَ' فَذَكَرْتَ اَنْ لَا' فَقَدْ اَعْرِفُ اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ (٦) ''میں نے تم سے سوال کیا کہ کیا اس کے دعویٰ (نبوت) سے پہلے تم لوگ اس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے تھے؟ تو تم نے کہا: نہیں۔ پس میں جان گیا کہ جو بندوں پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟ (یہ نہیں ہوسکتا)۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ' فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ اِلَى الْبِرِّ' وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ' وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا' وَاِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ اِلَى النَّارِ' وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا))(٧)

''سچائی کو اختیار کرو' کیونکہ سچائی نیکی (اور اللہ تعالیٰ کی وفاداری) کی راہ پر لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ پر کاربند رہتا ہے' حتیٰ کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ لیا جاتا ہے —— اور تم جھوٹ سے بچتے رہو' کیونکہ جھوٹ نافرمانی کی راہ پر لے جاتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔

آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ پر کاربند رہتا ہے' یہاں تک کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔''

جھوٹ۔سنگین گناہ

جھوٹ محض گناہ ہی نہیں بلکہ بہت سنگین گناہ ہے' خصوصاً اس صورت میں کہ ایک شخص تم پر اعتماد کرے اور تم اس کے حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اسی سے جھوٹ بولو۔ سفیان بن اسید حضرمی ؓ روایت کرتے ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا ہے' آپؐ فرماتے تھے:

((كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ لَهٗ بِهٖ كَاذِبٌ)) (۸)

''یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی بیان کرو درآنحالیکہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔''

صاحبِ معارف الحدیث جامع الترمذی کے حوالے سے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صحابہ کرام ؓ سے ارشاد فرمایا اور تین دفعہ ارشاد فرمایا: ''کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ سب سے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ پھر آپؐ نے فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ شریک کرنا (۲) ماں باپ کی نافرمانی کرنا (۳) معاملات میں جھوٹی گواہی دینا اور (۴) جھوٹ بولنا' راوی کا بیان ہے کہ پہلے آپؐ سہارا لگائے ہوئے بیٹھے تھے لیکن پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بار بار آپؐ نے اس ارشاد کو دہرایا یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ کاش اب آپؐ خاموش ہو جائیں۔''

جھوٹ اور لعنت

لعنت اسلام کی لغت میں سخت ترین لفظ ہے جس کے معنی کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینے اور دھتکار دینے کے ہیں۔ کسی شخص پر اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی رحمت اور توفیق کے اثر پذیر ہونے سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے۔ قرآن حکیم میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے' یہودیوں اور کافروں کو بھی اس کی وعید سنائی گئی ہے' لیکن کسی مؤمن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا' البتہ جھوٹے الزام لگانے کی صورت میں اللہ نے لعنت بھیجنے کی اجازت دی ہے۔ مباہلہ کے موقع پر فرمایا گیا کہ دونوں فریق اللہ سے دعا مانگیں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو:

﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴿۶۱﴾﴾ (آل عمران)

''پھر دعا کریں ہم سب اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

انسان کی طرف سے کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی بددعا کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے: ﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۸﴾﴾ (ھود) ''سن رکھو کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے''۔ جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان بوجھ کر کوئی انجان بن جائے' حق کا علم رکھتے ہوئے بھی اس کے اظہار سے باز رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں واضح الفاظ میں ایسے جھوٹوں پر لعنت فرمائی ہے۔

جھوٹ۔نفاق کی علامت

زبان اور دل میں رفاقت نہ ہو تو یہ نفاق کی علامت ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۹)

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے' وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور جب اس کو کسی چیز کا امین بنا دیا جائے تو خیانت کرے۔''

گویا جھوٹ' خیانت اور وعدہ خلافی منافقوں کے اخلاق ہیں' اگر کوئی صحت عقیدہ سے متصف ہو مگر مذکورہ بالا اخلاق اس میں موجود ہوں تو وہ عمل اور سیرت کے اعتبار سے منافق ہی ہے۔ قرآن حکیم نے صراحت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴿۱﴾﴾ (المنافقون) ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔''

جھوٹ کی وسعت

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جو متعدد دوسری برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ جھوٹا آدمی بلاتامل ہر برائی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ وہ نہ تو کسی محسن کا احسان مانتا ہے اور نہ کسی دوسرے پر اعتبار کرتا ہے' اس لیے کہ وہ خود جھوٹا ہے۔ بعض اوقات تو وہ بڑی بےباکی اور دلیری سے کذب بیانی کرتا ہے اور حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور اس کا عضو عضو جھوٹ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے: ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴿۱۶﴾﴾ (العلق) ''جھوٹی خطاکار پیشانی''۔ پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ایسا ٹیکہ ہے جو مٹائے نہیں مٹتا۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا جنہوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا' اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا گیا: ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ

عَلَيْهِمْ ﴾(الاحزاب) ''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی صدق دل سے ایمان لے آئیں تو معاف کر دیا جائے)۔''

جھوٹ اور ریاکاری

ریاکاری اور نمود و نمائش بھی جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے' یعنی خود کو ایسے روپ میں ظاہر کرنا جو حقیقت کا نقیض ہو۔ ایسا آدمی جو خود کو جس شکل میں باور کرانا چاہتا ہے عملاً اس سے مختلف ہے تو وہ کاذب ہے۔ بعض جھوٹ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں اور انہیں جھوٹ نہیں سمجھتے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے بھی اجتناب کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ جھوٹ کی ایسی صورتوں کا احادیث مبارکہ میں ذکر موجود ہے۔

بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ

حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں:

دَعَتْنِیْ اُمِّیْ یَوْمًا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَاعِدٌ فِیْ بَیْتِنَا' فَقَالَتْ: هَا تَعَالَ اُعْطِیْكَ' فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا اَرَدْتِ اَنْ تُعْطِیْهِ؟)) قَالَتْ: اُعْطِیْهِ تَمْرًا: فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَمَا اِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِهٖ شَیْئًا كُتِبَتْ عَلَیْكِ كِذْبَةٌ)) (۱۰)

''ایک دن جبکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے' میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا: ادھر آؤ' میں تمہیں کچھ دوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے میری ماں سے فرمایا: تم نے اس بچے کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟ میری ماں نے عرض کیا: میں نے اسے ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: یاد رکھو اگر اس کہنے کے بعد تم اس بچے کو کوئی چیز بھی نہ دیتی تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔''

مائیں بالعموم اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ موٹ بات کر دیتی ہیں' مگر تربیتی نقطۂ نگاہ سے ایسا بہلاوا اچھے اثرات نہیں چھوڑتا۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ کسی شکل میں بھی اپنی زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے۔

خوش گپّی کے طور پر جھوٹ

بعض لوگ تفنن طبع کے طور پر دوسروں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ رسول

اللہ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا۔ بہز بن حکیم بواسطہ اپنے والد کے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَیْلٌ لِلَّذِیْ یُحَدِّثُ فَیَكْذِبُ لِیُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ' وَیْلٌ لَهٗ وَیْلٌ لَهٗ))(۱۱)

''جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لیے اپنے بیان میں جھوٹ بولے اس پر افسوس! اس پر افسوس!''

معلوم ہوا کہ خوش گپّی کے طور پر لطفِ صحبت کے لیے غلط بیانی کرنا بھی جھوٹ ہے گو اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔

سنی سنائی باتوں کو تحقیق کیے بغیر بیان کرنا' ربط و تعلق اور رشتہ کی مناسبت سے گواہی دینا حالانکہ وہ درست نہ ہو' جھوٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسے جھوٹوں سے زبان کی حفاظت کرنا اور احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔

نہایت خطرناک جھوٹ

ایک نہایت خطرناک جھوٹ یہ ہے کہ جس سے دوسروں کے حقوق پامال ہوں اور ان کی عزت و آبرو کو گزند پہنچے اور اس طرح معاشرتی نظام میں ابتری اور خلل رونما ہو' ایسے جھوٹ کو اسلام نے ''قَوْلَ الزُّوْرِ'' اور اِفك سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔ قرآن حکیم نے ایسے جھوٹ کو شرک کے مماثل قرار دیا ہے: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿٣٠﴾﴾ (الحج) ''بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو''۔ زُور اگرچہ عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں مگر حدیث کی رو سے اس سے جھوٹی شہادت مراد ہے۔ افك اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے جس کے معنی کسی پر جھوٹ باندھنے کے ہیں۔ مشرک بھی اللہ پر جھوٹ باندھا کرتے تھے' کتاب حکیم میں اسے افك سے تعبیر کیا گیا ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگائی تھی اسے بھی سورۃ النور' آیت ۱۱ میں افك سے موسوم کیا گیا ہے۔ قرآن نے کہا: ﴿تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ﴿٢٢٢﴾﴾ (الشعراء) ''(اور شیطان تو) اُترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔''

خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کی تدبیر

خانگی زندگی کو سازگار بنانے اور گھریلو ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لیے تدبر و تعقّل سے کام لے کر اسے فساد و انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے موزوں اور مناسب حکمت عملی سے کام لینے

میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسی ذومعنی بات جو جھوٹ کے زمرے میں نہ آتی ہو مگر اس سے بگاڑ کا استیصال ہوتا ہو تو اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ درج ذیل احادیث سے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ حضرت صفوان بن سلیم ؓ سے روایت ہے:

اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: اَكْذِبُ امْرَاَتِيْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا خَيْرَ فِي الْكَذِبِ)) فَقَالَ الرَّجُلُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَعِدُهَا وَاَقُوْلُ لَهَا' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَا جُنَاحَ عَلَيْكَ)) (۱۲)

''ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں اپنی بیوی سے کوئی بات جھوٹ کہہ سکتا ہوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں' جھوٹ میں کوئی خیر نہیں''۔ آدمی نے کہا: یارسول اللہ' میں اس سے کوئی وعدہ کرلوں اور کوئی بات تسلی کی کرلوں (تو کیا یہ جائز ہوگا)؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس میں کچھ حرج نہیں۔''

گویا معقولیت سے مصالحت کی خاطر بیوی کو کوئی جھوٹا چکمہ دیے بغیر کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

صلح جوئی کی کوشش

اختلاف اور فتنہ کو ختم کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ کہہ دینا بھی جھوٹ نہیں جیسا کہ فرمایا گیا۔ اُم کلثوم ؓ (بنت عقبہ بن ابی معیط) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا وَيَنْمِيْ خَيْرًا)) (۱۳)

''وہ آدمی جھوٹا (اور گنہگار) نہیں ہے جو باہم لڑنے والے آدمیوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے اور اس سلسلہ میں (ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو) خیر اور بھلائی کی باتیں پہنچائے اور (مثبت اثر ڈالنے والی) اچھی باتیں کرے۔''

دو شخصوں یا دو گروہوں کے مابین بعض اوقات تنازعہ بڑھنے لگتا ہے' رنجش اور دشمنی میں اضافہ ہونے لگتا ہے' قتل وغارت اور خون ریزی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ عداوت کا جوش ظلم و تعدی میں بدلنے لگتا ہے۔ ایسے میں اگر کچھ بے غرض اور صلح جو بندے دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے آگے بڑھیں اور جنگ وعداوت کی آگ کو بجھانے کے لیے کوشاں ہوں' اپنی خوش کن باتوں سے حدت وتپش آسا ماحول کو اخوت اور بھائی چارے میں

بدل دیں تو ان کی صلح جویانہ باتیں جھوٹ میں شمار نہ ہوں گی۔ سعدی شیرازی کا مقولہ بھی ہمیں اس صورت حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے: ''دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' یعنی مصلحت آمیز گفتگو ایسی سچائی سے بہتر ہے جو فتنہ وفساد میں اضافہ کردے۔

ذومعنی بات میں حکمت

بعض نازک مواقع پر مغالطہ آمیز اور ذومعنی بات کرنے کی عمدہ مثالیں ہمیں حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں بھی ملتی ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے سفر میں' جبکہ آپؓ نبی مکرم ﷺ کے رفیق تھے اور کفارِ مکہ نے حضور ﷺ کی گرفتاری کے لیے آدمی پھیلا رکھے تھے' حضرت ابوبکر ؓ کا ایک شناسا ان کے سر پر آن پہنچا۔ اس نے ان کو مخاطب کر کے استفسار کیا: مَنْ مَعَكَ هٰذَا؟ (یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟) حضور ﷺ کے شناخت ہوجانے میں کتنے خطرات درپیش ہوسکتے تھے' لیکن آپؓ نے بڑی سادگی سے کہا: رَجُلٌ يَهْدِيْنِي الطَّرِيقَ (ایک شخص ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے)۔ حضور ﷺ سے بڑھ کر صحیح راستہ دکھانے والا کون ہوسکتا ہے؟ بات سچ پر مبنی تھی' بات بن گئی اور خطرہ ٹل گیا۔ حضور ﷺ اور ان کے رفیقِ سفر سلامتی سے نکل گئے۔ اسی طرح مرکزی بت خانے میں گھس کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔ اس کے بعد لوگوں نے جب اپنے خداؤں کی یہ درگت بنی دیکھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کا جو مکالمہ ہوا' قرآن حکیم اسے بایں الفاظ بیان کرتا ہے:

﴿قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء)

وہ کہنے لگے: ''کیوں ابراہیم' تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے' انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں!''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس بت شکنی کے فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب کرنا اپنے مخالفین پر حجت قائم کرنے کے مترادف تھا' تسفیل کے انداز میں یہ معلمانہ اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا تاکہ وہ سوچ بچار کرنے لگیں' توحید کا تصور ان پر اجاگر ہوجائے اور بتوں کی بے بسی ان پر آشکار ہوجائے۔ یہ مشرکین کے عقائد پر طنز بھی تھا اور تفہیم کا ایک انداز بھی جسے جھوٹ سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب سن کر ان کے ضمیر نے انگڑائی لی: ﴿فَرَجَعُوْٓا

﴿اِلٰٓی اَنۡفُسِہِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّکُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾﴾ (الانبیاء) ''یہ سن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: واقعی تم خود ہی ظالم ہو''۔ یہ الگ بات کہ ان کی مت پھر پلٹ گئی' ضد اور جہالت ان پر سوار ہو گئی اور پھر اسی کج روی کی راہ پر چل پڑے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جھوٹ اور کذب بیانی کے مختلف پہلوؤں کی تصریح کی ہے۔ اس تمام تر بحث کا ماحصل یہ ہے کہ یہ ایک نہایت گھٹیا اور مذموم خصلت ہے' جو نظامِ معاشرت میں فساد اور انتشار و اختلال کا موجب بنتی ہے' روابط و تعلقات کو بگاڑتی اور کشیدگی میں اضافہ کرتی ہے۔ اس سے سیاسی ماحول میں ابتری پیدا ہوتی ہے' معیشت اونچ نیچ کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہے' اعتماد کی کیفیت متزلزل ہوتی ہے' ضبط و انضباط اور ڈسپلن کی چولیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں' مودّت و مؤاخات کدورت و نفرت میں بدل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے شمار مفاسد اس کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ اس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں' البتہ بدبو اور تعفّن ہے جس کی سڑاند سے فضائیں مسموم ہوتی ہیں اور عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''صدق نجات دیتا اور جھوٹ تباہ و ہلاک کرتا ہے۔''

حواشی

(۱) مؤطا مالك' كتاب الجامع' باب ما جاء فی الصدق والكذب۔

(۲۔۳) ایضاً۔

(٤) مسند احمد' كتاب باقی مسند الانصار' راوی: ابوامامه ؓ ۔

(٥) سنن الترمذی' كتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی الصدق والكذب۔

(٦) صحيح البخاری' كتاب بدء الوحی' باب بدء الوحی۔

(٧) صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله۔

(٨) سنن ابی داوٗد' كتاب الادب' باب فی المعاريض۔

(٩) صحيح البخاری' كتاب الايمان' باب علامة المنافق **ومتعدد مقامات**۔

(١٠) سنن ابی داوٗد' كتاب الادب' باب فی التشديد فی الكذب ۔

(١١) سنن الترمذی' كتاب الزهد عن رسول اللهﷺ' باب فيمن تكلم بكلمة يضحك بها الناس۔ وسنن ابی داوٗد' كتاب الادب' باب فی التشديد فی الكذب (واللفظ له)۔

(١٢) موطا مالك' كتاب الجامع' باب ما جاء فی الصدق والكذب۔

(١٣) صحيح البخاری' كتاب الصلح' باب ليس الكاذب الذی يصلح بين الناس۔ وصحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب تحريم الكذب وبيان المباح منه (واللفظ له)۔

سیرتِ خیر الانام ﷺ

بانیٔ تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے پانچ فکر انگیز خطابات

1 فلسفۂ دین میں نبوت و رسالت کا مقام و مرتبہ

2 نبی اکرم ﷺ پر تکمیل نبوت و رسالت کے مظاہر

3 انقلابِ نبویؐ کا مرحلہ اوّل کردار سازی کا نبویؐ طریق

4 انقلاب اسلامی میں باطل سے تصادم کا مرحلہ اوّل

5 انقلابِ اسلامی میں باطل سے تصادم کے مراحل

دو DVDs پر مشتمل پیک' قیمت 100 روپے (علاوہ کوریئر چارجز 100 روپے)

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی' K-36 ماڈل ٹاؤن' لاہور فون: 3-35869501-42-92+

ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

تحریک تجدّد اور متجدّدین (۴)

حافظ محمد زبیر

طٰہٰ حسین

۱۸۸۹ء میں مصر کے علاقہ 'منیا' میں پیدا ہوئے۔ عربی زبان و ادب کی نمایاں شخصیات میں شمار ہوتے ہیں اور 'عميد الأدب العربي' کے لقب سے معروف ہوئے۔ ذاتی زندگی (biography) پر لکھنے کا آغاز ان سے ہوا اور ان کی اس بارے میں معروف کتاب 'الأيام' ہے جس میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کو بیان کیا ہے۔ طٰہٰ حسین تیرہ بہن بھائی تھے جن میں ان کا نمبر ساتواں تھا۔ تین سال کی عمر میں ان کی نظر ضائع ہوگئی۔ بچپن میں ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جامعہ ازہر سے وابستہ ہوگئے اور وہاں سے مذہب اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے اور وہاں قدیم مصری تہذیب' اسلامی تہذیب' جغرافیہ' فلکیات' فلسفہ اور ادب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں اسی یونیورسٹی سے معروف عربی شاعر 'ابو العلا المعری' پر اپنی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے فرانس کی معروف یونیورسٹی 'سار بون' سے معروف مؤرخ 'ابن خلدون' کے موضوع پر ۱۹۱۷ء میں اپنی دوسری پی۔ ایچ۔ ڈی بھی مکمل کی اور ۱۹۱۸ء میں مصر واپس آ گئے۔ ۱۹۱۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں مصر میں وزارتِ تعلیم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ان کی قاہرہ میں وفات ہوئی۔

افکار اور نظریات

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا اکثر و بیشتر تحقیقی کام عربی ادب اور تاریخ پر ہے۔ ان کی معروف کتابوں میں الأيام' في الشعر الجاهلي' اور الأدب الجاهلي ہیں۔ اس کے علاوہ کتب اور مقالات میں الفتنة الكبرىٰ عثمان' الفتنة الكبرىٰ علي وبنوه' على هامش السيرة' حديث

الأربعاء' من حديث الشعر والنثر' مستقبل الثقافة في مصر' أديب' شجرة السعادة' الوعد الحق' الشيخان' مع المتنبي اور ذكرى أبي العلاء کے نام سے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں طٰہٰ حسین نے 'في الشعر الجاهلي' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ جاہلی شاعری یا جاہلی ادب اسلام کے ظہور کے بعد مرتب ہوا ہے اور اس کی نسبت ماقبل اسلام دورِ جاہلیت کی طرف کر دی گئی ہے۔ ان کے اس نقطہ نظر پر فلسفہ اور علم لغت کے ماہرین میں سے مصطفیٰ صادق رافعی' خضر حسین' شیخ محمد خضری اور محمد لطفی جمعہ نے نقد کی۔

اسی طرح جامعہ ازہر کے بعض علماء نے بھی ان کی اس کتاب پر مذہبی پہلو سے نقد کی اور چار مقامات پر اعتراضات وارد کیے' جن کا تذکرہ 'في الشعر الجاهلي' کے نئے ایڈیشن کے آخر میں کیا گیا ہے: (ا) ان میں سے ایک اعتراض تو یہ تھا کہ طٰہٰ حسین نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے وجود اور ان کے بیت اللہ کی تعمیر والے واقعے کے ثبوت میں تاریخی روایات نہ ہونے کی وجہ سے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے —— اس کا جواب طٰہٰ حسین کے بعض شاگردوں کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ انہوں نے بعض دوسرے مقامات پر اس واقعے کے ثبوت سے متعلق اپنے یقین کا اظہار بھی کیا ہے۔ (ب) دوسرا اعتراض یہ تھا کہ طٰہٰ حسین نے سبعہ و عشرہ قراءات کو منزل من اللہ ماننے سے انکار کیا ہے' ان کے خیال میں ''سبعة احرف'' سے مراد لغات کا اختلاف ہے —— انہوں نے اپنی ایک دوسری کتاب میں یہ واضح کیا ہے کہ وہ قراءات کے منکر نہیں ہیں اور اس کے ساتھ ہی ابن جریر طبری کا موقف تفصیل سے نقل کر دیا اور کہا کہ اس پر غور کریں' کیا یہ قراءات کا انکار ہے؟ (ج) تیسرا اعتراض یہ وارد کیا گیا کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کے نسب نامے کی توہین کی ہے۔ (د) چوتھا اعتراض یہ وارد کیا گیا کہ انہوں نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ دین اسلام' دین ابراہیمی ہی کا ایک تسلسل ہے اور وہ یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ عرب کا اصل دین' دین ابراہیمی تھا۔

ہم ان اعتراضات کو بغور جانچنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ان چار مقامات میں طٰہٰ حسین کی عبارت میں تسامح موجود ہے' اگرچہ یہ ان کے کوئی پختہ عقائد معلوم نہیں ہوتے' کیونکہ یہ چاروں مقامات اس کتاب کے بنیادی موضوع سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ذیلی بحث اور مناظرانہ اسلوب کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔ بہر حال مصری حکومت نے ان چار مقامات کو

حذف کرنے کے بعد اس کتاب کی اشاعت کی اجازت دے دی ہے۔ جہاں تک طٰہٰ حسین کے ادب جاہلی یا اس کی تاریخ پر نقد کا معاملہ ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر نقد نہ ہو سکے اور نہ ہی ادب جاہلی کو قرآن یا حدیث کی طرح کوئی تقدس حاصل ہے یا اس کی حفاظت کی ذمہ داری ربّ سبحانہ وتعالیٰ نے لی ہے۔ پس جس علمی اسلوب میں طٰہٰ حسین نے ادب جاہلی کو مشکوک قرار دیا ہے' اگر کسی کو اس بحث سے اتفاق نہیں ہے تو اسی علمی اسلوب میں اس کا جواب دینا چاہیے اور مصر کے معروف شعراء' ادباء اور ماہرین لغت نے طٰہٰ حسین کی اس تحقیق کا مسکت جواب دیا بھی ہے۔

اس کتاب کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے 'الأدب الجاھلي' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے مصر میں عربی زبان وادب کے نصاب اور طریقہ تدریس پر کڑی نقد کی ہے۔ ان کے بقول فقہ کی طرح عربی ادب میں بھی تقلیدی جمود کی وجہ سے پہلی تین صدیوں کے بعد کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا ہے۔ طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ عربی ادب اور اس کی تاریخ کی تعلیم سے پہلے یہ ضرور جانچ لینا چاہیے کہ جو شے ہم عربی ادب کے نام پر پڑھانا چاہتے ہیں' وہ عربی ادب ہے بھی یا نہیں۔

انہوں نے عربی ادب اور تاریخ کی حقیقت جانچنے کے لیے مغربی طریقہ تحقیق کو بہترین طریق کار قرار دیا ہے جس کے مطابق کسی چیز پر تحقیق کرنے سے پہلے اپنے ذہن کو اس سے خالی کر لیا جاتا ہے' یعنی اس کے وجود کو عدم سمجھتے ہوئے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں معروف فلسفی ڈیکارٹ کا بھی یہی طریقہ تحقیق تھا۔ طٰہٰ حسین کا کہنا یہ ہے کہ ادب جاہلی کے نام سے جو ادب ہمارے ہاں پایا جاتا ہے یا پڑھایا جاتا ہے' وہ مشکوک ہے اور اس کی نسبت جاہلی شعراء کی طرف صحیح نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے بقول اس جاہلی ادب کا اکثر حصہ گھڑا گیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر مجھے دورِ جاہلیت کی تہذیب اور کلچر معلوم کرنا ہوگا تو میں قرآن کی طرف رجوع کروں گا نہ کہ جاہلی شعراء امرؤ القیس' نابغہ' اعشیٰ' زہیر' قس بن ساعدہ اور اکثم بن صیفی کے معلقات یا اشعار کی طرف' کیونکہ ان اشعار کی نسبت ان شعراء کی طرف ثابت نہیں ہے۔ طٰہٰ حسین کا کہنا یہ بھی ہے کہ ادب جاہلی میں جو شعراء مشہور ہیں' وہ اکثر و بیشتر یمنی قحطانی عرب ہیں یا پھر عدنانی ہیں اور ان دونوں قبیلوں کی زبان ان کے بقول عربی زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان عربی کی نسبت حبشی زبان کے زیادہ قریب ہے' لہٰذا ادبِ جاہلی یا ان

قبیلوں کے شعراء کا کلام' عربی زبان کا ادب کیونکر قرار پا سکتا ہے؟ ان کا کہنا یہ ہے کہ عربی زبان کا اصل ادب قرآن مجید میں ہے۔ قرآن کا نزول لغت قریش میں ہوا اور قریش نے عرب کے بقیہ لہجات کو ختم کر دیا۔ پس اب اگر کسی نے ادب جاہلی کا مطالعہ کرنا ہو تو وہ قرآن کی نصوص کی روشنی میں اُس وقت کی جاہلی تہذیب اور کلچر کا مطالعہ کرے۔ اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں مولوی محمد رضا انصاری صاحب نے کیا ہے جسے انجمن ترقی اردو دہلی نے شائع کیا ہے۔

اپنی کتاب 'مستقبل الثقافة في مصر' میں انہوں نے کہا ہے کہ مصری تہذیب 'بحرابیض' کی تہذیب کا ایک حصہ ہے اور اس کا تعلق جزیرۂ عرب اور سوڈان کی نسبت لاطینی تہذیب سے زیادہ قریبی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے حاکم مصر خدیوی اسماعیل پر یہ زور دیا کہ مصر کو یورپ کا حصہ بنایا جائے۔ اسی کتاب میں انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ہمیں اہلِ مغرب کی تہذیب کی تقلید کرنی چاہیے تاکہ ہم ان کے بالمقابل کھڑے ہو سکیں۔ انہوں نے اس کتاب میں مصر میں قومیت پرستی کی بنیادوں پر ایک ایسی حکومت تشکیل دینے کی ترغیب دی ہے جس میں دین کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ اس کتاب پر محمد کمال حسین' استاذ ساطع حصری' ڈاکٹر زکی مبارک' ڈاکٹر محمد بہی' ڈاکٹر محمد حسین اور سید قطب نے عمدہ نقد کیا ہے۔

طٰہٰ حسین کی کتاب 'الشیخان' پر استاذ محمد عمر توفیق نے نقد کی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب 'علی ھامش السیرة' پر استاذ غازی التوبہ نے نقد کی ہے۔ ان کی کتاب 'حدیث الأربعاء' پر شیخ رفیق العظم نے نقد کی ہے۔ استاذ ابراہیم عبد القادر مازنی نے بھی اس کتاب پر نقد کی ہے۔ ان کی کتاب 'مع المتنبی' پر شیخ محمود محمد شاکر نے نقد کی ہے۔ ان کی کتاب 'ذکری أبي العلاء' پر استاذ محمد سلیم جندی نے نقد کی ہے۔ اسی طرح طٰہٰ حسین کی کتاب 'الفتنة الکبری' کے دونوں حصوں اور 'من بعید' پر استاذ غازی التوبہ نے نقد کی ہے۔

ڈاکٹر زکی مبارک نے طٰہٰ حسین پر اپنی نقد میں یہ الزام عائد کیا کہ 'ابن خلدون' پر ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مستشرق 'میسو کازانوا' کے افکار کا سرقہ ہے۔ مستشرق 'میسوماسینون' کا کہنا ہے کہ جب میں نے طٰہٰ حسین کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ evaluation کے لیے پڑھا تو کہا: 'هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا' یعنی یہ ہمارا ہی فکر ہے جو ہمیں لوٹا دیا گیا ہے اور جب میں ڈاکٹر زکی مبارک کی ابحاث پڑھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک جدید شخصیت ہے [ڈاکٹر زکی مبارک طٰہٰ حسین کے کلاس فیلو ہیں اور انہوں نے بھی مصر اور فرانس دونوں جگہ سے

پی۔ایچ۔ڈی کی ہے]۔ڈاکٹر زکی مبارک نے طٰہٰ حسین پر یہ بھی الزام لگایا کہ یہ ایک خالی ڈھول کی مانند ہے اور اسے عربی ادب کی تاریخ کا کچھ پتا نہیں ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سیاسی تعلقات کی بنا پر طٰہٰ حسین کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمد احمد غمراوی نے 'جهل طه حسين بمنهج ديكارت' کے نام سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں دعویٰ کیا ہے کہ طٰہٰ حسین ڈیکارٹ کے منہج تحقیق کی اتباع کے دعویدار ہیں حالانکہ انہیں اس کے منہج تحقیق کا پتا ہی نہ تھا۔استاذ انور جندی نے 'طه حسين في أحضان الاستشراق' کے نام سے ان پر نقد کی ہے۔اس مقالے میں انہوں نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب 'الشعر الجاهلي' کا مرکزی خیال مستشرق 'مرجلیوث' سے لیا ہے۔ اسی طرح 'مع المتنبي' نامی کتاب میں طٰہٰ حسین نے جو نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ مستشرق 'بلاشیر' کا ہے۔ابن خلدون پر اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے میں انہوں نے مستشرق 'دورکایم' سے استفادہ کیا ہے۔تنقید کا طریق کار انہوں نے 'تین' اور 'برودنیر' سے لیا ہے۔'حديث الأربعاء' نامی کتاب کا مرکزی خیال انہوں نے 'سانت بیف' سے اخذ کیا ہے۔تاریخ ادب کے مصادر پر بحث میں طٰہٰ حسین نے 'نلینو' سے استفادہ کیا ہے۔اسی طرح علم نحو کے ارتقاء میں ان کے افکار 'براجستیر' اور علم لغت میں 'جویدی' اور فقہ اللغہ میں 'لیتمان' سے ماخوذ ہیں۔قرآن کے بارے میں طٰہٰ حسین نے اپنے خیالات 'کازنوفا' سے لیے ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انہیں جامعہ ازہر میں قرآن نہیں سمجھ آیا بلکہ انہوں نے فرانس میں عیسائی مستشرق 'کازنوفا' سے قرآن سمجھا ہے۔طٰہٰ حسین کا کہنا تھا کہ ان کی زندگی میں 'نیلنو' اور 'لیتمان' کا بہت اثر ہے اور 'لیتمان' تو انہیں اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔استاذ عباس فضلی' محمود مہدی' ڈاکٹر فواد حسنین علی' استاذ احمد محمد جمال اور حسن البناء نے بھی طٰہٰ حسین پر نقد کی ہے۔

ان کی کتاب 'في الشعر الجاهلي' پر محمد لطفی جمعہ' استاذ محمد خضر حسین' محمد فرید وجدی' محمد خضری اور ڈاکٹر محمد احمد غمراوی نے نقد کی ہے۔ان سب حضرات کی طٰہٰ حسین پر تنقیدیں 'نقد كتاب الشعر الجاهلي' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ان حضرات نے طٰہٰ حسین پر یہ نقد کی ہے کہ انہوں نے اپنے منہج تحقیق میں معروف فلسفی ڈیکارٹ کی اتباع کا دعویٰ کیا ہے حالانکہ انہوں نے اس مسئلے میں اس کی اتباع نہیں کی۔ان حضرات کا کہنا یہ بھی ہے کہ طٰہٰ حسین ایک

بات فرض کرتے ہیں اور اس کے اوپر پھر ایک اور مفروضہ قائم کرتے ہیں اور اس طرح مفروضہ در مفروضہ کے نتیجے میں ایک حتمی اور قطعی نتیجے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ پس طٰہٰ حسین 'فليس يبعد!' یا 'فليس ما يمنع!' یا 'فما الذي يمنع!' کے الفاظ سے ایک بات کا آغاز کرتے ہیں اور 'أمر هذه القصة ذا واضح' کے الفاظ میں حتمی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔مثلاً قرآن کی لغت میں شعرِ جاہلی سے استفادہ کرنے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ بہت معروف ہے کہ ان سے ان کے ایک شاگرد نافع بن ازرق نے قرآن کے تقریباً ۸۰ مقامات سے متعلق الفاظ کے معانی دریافت کیے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان مقامات کے معانی بتلاتے ہوئے ادبِ جاہلی سے اشعار پڑھ کر سنائے۔ یہ واقعہ اکثر مفسّرین نے نقل کیا ہے' تفصیل کے لیے امام سیوطی کی کتاب 'الاتقان' کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس واقعے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اليس من الممكن أن تكون قصة ابن عباس ونافع بن الأزرق قد وضعت في تكلف و تصنع؟ ''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور نافع بن ازرق کا یہ قصہ تکلف اور تصنع سے گھڑ لیا گیا ہو؟'' اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے لیکن کسی شے کے امکان سے وہ چیز ثابت نہیں ہو جاتی' بلکہ اس کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایک واقعہ میں جھوٹ کا امکان ہے تو اس واقعے کی تحقیق' اس کے راویوں کی جانچ پڑتال اور قرائن کی چھان پھٹک ہوگی تو تب ہی اس واقعے کے بارے کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کتاب میں جاہلی شعر کے من گھڑت ہونے پر جتنے اعتراضات وارد کیے ہیں' ان حضرات نے جاہلی شعر ہی کے بیان کے ذریعے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے۔مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جاہلی شعر میں دین اور اخلاق سے متعلقہ تصورات موجود نہیں ہیں۔ان حضرات نے اس کے جواب میں جاہلی ادب کے وہ اشعار پیش کر دیے جن میں اعلیٰ اخلاقی اقدار یا دینداری کا تذکرہ تھا۔حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کی تنقید نے طٰہٰ حسین کے نکتہ نظر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ان حضرات نے جابجا یہ بھی واضح کیا ہے کہ جاہلی شعر سے متعلق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا کون سا موقف کس مستشرق کی فکر سے ماخوذ ہے۔امیر شکیب ارسلان نے بھی طٰہٰ حسین کی اس کتاب کا 'الشعر الجاهلي و الاسلام' کے نام سے رد کیا ہے۔اس کے علاوہ استاذ مصطفیٰ صادق رافعی نے 'نقد الشعر الجاهلي' کے نام سے طٰہٰ حسین کا رد کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے خلط مبحث کو علم کا نام دے دیا اور

مستشرقین کی تقلید کو اجتہاد سمجھ لیا اور عربی ادب کے مجدد ہونے کے دعوے دار بن گئے۔ ڈاکٹر محمد بہی نے بھی 'فکرة کتاب الشعر الجاهلی' کے نام سے اس کتاب کا رد کیا ہے۔

خلاصۂ کلام

ڈاکٹر طٰہٰ حسین پر عربی زبان وادب' آزادئ فکر اور آزادانہ اسلوب تحقیق کے حوالے سے تجدّد کا الزام لگایا جاتا ہے۔ جہاں تک عربی زبان وادب میں تجدد کا معاملہ ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی مستند اعتراض نہیں ہے کیونکہ یہ دینی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر اس مسئلے میں کسی کو ان کی تحقیق سے اتفاق نہیں ہے تو وہ اس کا علمی جواب دے۔ مصری ماہرین لغت' شعراء اور ادباء نے اس کا مسکت جواب دیا ہے اور یہی طرز عمل درست ہے۔

آزادئ فکر ان کے ہاں تھی۔ اگر تو یہ مذہب یا دین کی حدود کو پامال نہ کر رہی ہو تو اس وقت تک اس پر بھی کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا' لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ طٰہٰ حسین نے علوم شریعت سے جہالت کے باوجود کئی دینی مسائل میں اپنی نام نہاد علمی آراء کا اظہار کیا ہے اور عربی زبان وادب میں رسوخ رکھنے والے مصری علماء نے ان کا تتبع بھی کیا ہے' جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں بعض علماء کے نام ذکر کر چکے ہیں۔

جہاں تک ان کے طریق تحقیق کا معاملہ ہے کہ جس میں انہوں نے معروف فلسفی ڈیکارٹ کی اتباع کی ہے' تو ہمیں اس اندازِ تحقیق سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ انداز تحقیق درحقیقت یونانیوں کا ہے جن سے معتزلہ نے لیا اور بنوعباس کے دور میں اس پر خوب بحثیں کیں۔ اس اندازِ تحقیق کے مطابق اگر آپ خدا کو ماننے والوں میں سے ہیں اور اس کا اثبات کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے ذہن کو خدا کے ہر قسم کے تصوّرات سے پاک کریں' یہاں تک کہ خدا کے وجود اور عدم وجود میں سے آپ کسی بھی عقیدہ کے حامل نہ ہوں اور اب تحقیق کریں' اور آپ کی تحقیق جہاں آپ کو پہنچا دے آپ اس کو مان لیں' اور یہ خدا کے وجود کا یقین بھی ہو سکتا ہے اور عدم وجود کا شک بھی۔ کچھ اشیاء کے ثبوت میں تو یہ اندازِ تحقیق درست معلوم ہوتا ہے لیکن اگر قطعی اور یقینی چیزوں کے ثبوت کے لیے بھی یہ طریقہ تحقیق استعمال کیا جانے لگے تو سوائے گمراہی کے اور کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک سوال ہے کہ انہوں نے واقعتاً ڈیکارٹ کے منہج تحقیق کی پیروی کی بھی ہے یا نہیں؟

توفیق الحکیم

توفیق الحکیم معروف ترین مصری ادیب ناول نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ وہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۸ء کو اسکندریہ کے علاقہ میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات ۲۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی گریجویشن مکمل کی اور اس کے بعد اپنے والد کی خواہش پر قانون کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۵ء میں قانون کی تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے بطور وکیل پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۲۵ء میں ہی ان کے والد نے اپنے سیاسی تعلقات کی بنیاد پر قانون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے پیرس میں ان کا داخلہ کروا دیا۔ ان کے پیرس جانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ بعض معاصرین نے جب ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے ڈرامہ 'عودة الروح' میں فرعونی مصری تہذیب کی طرف اپنے میلان کا اظہار کیا ہے تو ان کے والد نے ان کو مصر سے فرانس بھیج دیا تا کہ وہ ڈرامہ نویسی کو خیر باد کہہ دیں اور قانون کی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن پیرس میں اپنے تین سالہ قیام کے دوران انہوں نے قانون کی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی بجائے فرانسیسی سینما اور تھیٹر کے چکر لگانے شروع کیے۔ فرانسیسی، یورپین اور یونانی لٹریچر، لوک کہانیوں جنگوں اور ڈراموں کے علوم وفنون اور اصول وضوابط کا قریب اور گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ ۱۹۲۸ء میں توفیق الحکیم بغیر کسی ڈگری کے حصول کے مصر واپس آ گئے۔ ۱۹۲۹ء میں وزارتِ عدل وانصاف میں دوبارہ وکالت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے لیکن اس پیشے میں ان کا دل نہ لگ سکا۔ ۱۹۳۴ء میں وزارتِ تعلیم میں تحقیقاتی کمیٹی کے صدر بن گئے۔ بعد ازاں انہوں نے ۱۹۳۷ء میں موسیقی اور ڈرامہ وغیرہ سے متعلقہ وزارت میں بطور ڈائریکٹر کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں 'دار الكتب المصرية' کے مدیر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں انہیں 'مجمع اللغة العربية' کے لیے بطور رکن منتخب کیا گیا اور وہ تاحیات اس کے ممبر رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ثقافت اور کلچر وغیرہ کی وزارت کے وکیل کے عہدے کے لیے سینٹ کے رکن کے طور پر ان کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں پیرس میں یونیسکو تنظیم کے لیے مصری حکومت کی طرف سے مندوب مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں پھر مصر واپس آ گئے اور اپنے سابقہ عہدے پر دوبارہ کام شروع کر دیا۔ بعد ازاں معروف مصری اخبار 'الأهرام' میں بطور مشیر کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں اس اخبار کی مجلسِ ادارت کے رکن بھی مقرر ہوئے۔

ان کی شہرت کا سبب اصحابِ کہف کے بارے میں ان کا لکھا ہوا ڈرامہ بنا جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے ڈراموں میں مصری تہذیب اور تاریخ کو نمایاں کیا گیا ہے چاہے وہ فرعونی و قبطی ہو یا عربی و اسلامی۔ توفیق الحکیم جدید عربی ادب کے ستونوں میں سے طٰہٰ حسین' عباس عقاد' احمد امین' سلامہ موسیٰ' احمد شوقی اور حافظ ابراہیم وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی۔

والدین

توفیق الحکیم پر نقد کرنے والوں نے ان کے والدین کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ناقدین کے بقول توفیق الحکیم کے والدین ان کی مناسب تربیت نہ کر سکے جس کی وجہ سے دینی اعتبار سے ان کی شخصیت میں بہت سی کمیاں اور کوتاہیاں رہ گئی تھیں۔ توفیق الحکیم نے اپنی کتاب 'سجن العمر' میں لکھا ہے کہ ان کی والدہ کی ایک بہن تھی اور ان کی والدہ اور خالہ کے مابین ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی تھی' یہاں تک کہ انہوں نے ان دونوں بہنوں کے مابین کبھی بھی اتحاد و اتفاق نہ دیکھا۔ توفیق الحکیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی والدہ مزاج کی تیز اور اپنی ضد کی پکّی تھیں۔ علاوہ ازیں ان کی والدہ انہیں ہمیشہ یہ جتلاتی رہتی تھیں کہ وہ ان کے والد سے زیادہ ذہین ہیں۔ توفیق الحکیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے جب پکّی قسم کھانی ہوتی تھی تو معروف صوفی اور زاہد ابو یزید بسطامی کی قسم کھاتی تھیں اور اپنے بچوں کو بھی اسی کی تعلیم دیتی تھیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر میری والدہ حیاتِ نبی ﷺ کی قسم اٹھا لیتیں تو اس میں تو جھوٹ کا احتمال ہونے کا امکان ہوتا تھا لیکن جب وہ ابو یزید بسطامی کی قسم اٹھاتی تھیں تو ہر قسم کے جھوٹ کا احتمال رفع ہو جاتا تھا۔ یہ ساری باتیں توفیق الحکیم نے اپنی آپ بیتی 'سجن العمر' میں بیان کی ہیں۔ اپنے احوال و ظروف پر توفیق الحکیم نے دو کتابیں تصنیف کی ہیں' ایک 'سجن العمر' اور دوسری 'زهرة العمر'۔

بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ توفیق الحکیم اپنی والدہ سے متاثر ہو کر عمر بھر اس قسم کے فاسد عقائد کے حامل رہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب 'عصفور من الشرق' کا انتساب لکھتے ہوئے 'إلى حامیتي الطاهرة السیدة زینب' کے الفاظ استعمال کیے' یعنی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو انہوں نے حامیہ [بچانے والی اور دوسرے الفاظ میں بیڑا پار لگانے والی] قرار دیا ہے۔ توفیق الحکیم نے 'سجن العمر' میں ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے معلوم

ہوتا ہے کہ ان کی والدہ کو اپنی اولاد کی نسبت اپنی ذات اور خواہشات سے زیادہ محبت تھی۔

اپنے والد کی دینی حالت کے بارے میں توفیق الحکیم نے لکھا ہے کہ دین کے بارے میں ان کے خیالات میں تناقض اور تضاد تھا۔ وہ بظاہر نماز روزے کے پابند تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھ سے جنت و جہنم کے وجود اور عدم وجود پر فلسفیانہ گفتگو بھی فرما لیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے والد اپنی نوجوانی میں شراب نوشی بھی کرتے تھے بعد ازاں ان کی والدہ کو علم ہو جانے کے بعد انہوں نے اس قبیح عادت کو ترک کر دیا۔

توفیق الحکیم کی فکری نشوونما

توفیق الحکیم کی فکری نشوونما میں پانچ چیزوں کا کردار بہت نمایاں رہا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلی شے جس نے توفیق الحکیم کی فکری بلوغت میں اہم کردار ادا کیا وہ لوک کہانیاں ہیں۔ ان کے بقول ان کی والدہ ان کو بچپن سے ہی ابو زید ہلالی اور الف لیلہ کی کہانیاں بہت زیادہ سنایا کرتی تھیں۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انہوں نے عربی میں ترجمہ شدہ یورپین ادب کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ توفیق الحکیم کا کہنا ہے کہ انہیں بچپن میں اس قسم کی کہانیاں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا' یہاں تک کہ والد کے منع کرنے کے باوجود وہ چارپائی کے نیچے گھس کر لالٹین کی روشنی میں کہانیاں پڑھا کرتے تھے۔

(۲) دوسرے مرحلے میں ہائی سکول کی تعلیم کے دوران توفیق الحکیم کی توجہ عربی ادب کی طرف ہوئی اور انہوں نے معروف معتزلی عربی ادیب جاحظ اور دیگر شعراء اور ادباء کی کتب کا مطالعہ شروع کیا۔

(۳) تیسرے مرحلے میں ان کا تعلق سینما اور ڈرامہ سے قائم ہوا۔ ہائی سکول کے زمانے ہی سے انہوں نے سینما کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے اور اسی تعلق کی نسبت سے بعد ازاں وہ مصر کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار کے طور پر معروف ہوئے۔

(۴) قاہرہ میں قانون کی تعلیم کے دوران ان کا تعلق گلوکاروں اور تھیٹر شو والوں کے ساتھ بھی قائم ہوا' جس نے ان کے اخلاق اور دین پر آئندہ کی زندگی میں برے اثرات چھوڑے۔

(۵) فرانس میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے دوران ان کا تعلق یورپین اور فرانسیسی کلچر سے قائم ہوا اور انہوں نے یہاں معروف فلسفی سپنسر کی عربی میں ترجمہ شدہ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ڈکشنری کی مدد سے براہ راست فرانسیسی زبان میں

بھی فرانسیسی ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ ان کے بقول فرانسیسی ثقافت نے ان کے فکر کی اٹھان میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

(٦) دینی کتب کے مطالعہ نے بھی ان کے فکر پر گہرا تاثر چھوڑا۔ ان کے بقول انہوں نے اپنی تحریروں میں قرآن، تورات اور انجیل وغیرہ سے کافی استفادہ کیا ہے۔ اپنے معروف ڈرامہ 'سلمان الحكيم' کے بارے انہوں نے کہا کہ میں نے اس کی بنیاد قرآن، تورات اور الف لیلہ پر رکھی ہے۔

شخصیّت کی پیچیدگی

توفیق الحکیم پر نقد کرنے والے اہل علم ان کی شخصیت کو ایک انتہائی گنجلک اور پیچیدہ شخصیت قرار دیتے ہیں، جیسا کہ توفیق الحکیم نے خود اپنے بارے میں یہ لکھا ہے: **إنى أعيش فى الظاهر كما يعيش الناس فى هذه البلاد أما فى الباطن فما زالت آلهتى وعقائدى ومثلى العليا كل آلامى مرجعها هذا التناقض بين حياتى الظاهرة وحياتى الباطنة** یعنی میں ظاہری طور پر تو ایسے ہی زندگی گزار رہا ہوں جیسا کہ عام لوگ شہروں میں رہتے ہیں لیکن میرے باطن میں میرے کچھ معبود، عقائد اور بلند آئیڈیلز ہیں۔ میرا سارا دردِ سر میری ظاہری اور باطنی زندگی کا یہ تناقض ہے۔

اسی تناقض کی جھلک ان کی دینی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے بقول وہ نوجوانی کے زمانے میں اپنے باپ کے ڈر سے صبح افطاری کر لیتے تھے لیکن بعد میں چپکے سے روزہ توڑ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے سے متعلق عورتوں کے ساتھ چھیڑ خوانی، استمناء بالید، زنا اور شراب نوشی کے بعض واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب '**زهرة العمر**' میں لکھا ہے کہ وہ تین مہینے تک ایک جرمن رقاصہ کے ساتھ ایک ہی کمرے میں ایک ہی چارپائی پر سوتے رہے۔ ناقدین نے لکھا ہے کہ گناہ گار تو ہر انسان ہوتا ہے لیکن توفیق الحکیم 'مجاہر' تھے۔ مجاہر حدیث کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہ کرے اور پھر اسے فخر سے بیان کرے اور اس پر کسی ندامت اور پشیمانی کا اظہار نہ کرے۔ مجاہرین کے لیے حدیثِ رسول میں وعید آئی ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے گا۔

کتب اور ادبی کام

توفیق الحکیم کا اصل اور زیادہ تر کام مصری ڈرامہ اور افسانہ پر ہے۔ انہیں مصر کا سب سے بڑا ڈرامہ اور افسانہ نویس شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے معروف ڈراموں میں **أهل الكهف، شهرزاد، مشكلة الحكم، بجماليون، سليمان الحكيم، الملك أو ديب، الأيدى الناعمة، الصفقة** اور **لعبة الموت** ہیں۔

ان کے معروف ناولوں میں **عوده الروح، عصفور من الشرق، حمار الحكيم، الرباط المقدس** اور **وأشعب** ہیں۔ انہوں نے سیاست پر بھی بعض کتابیں لکھیں، جیسا کہ ان کی کتاب '**عودة الوعى**' اور '**مصر بين عهدين**' ہے۔ اپنی ذاتی زندگی پر انہوں نے '**سجن العمر**' اور '**زهرة العمر**' کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں۔

فکر اسلامی پر ان کی کتابوں میں **التعادلية، التعادلية مع الاسلام، أرنى الله، تحت شمس الفكر** اور **الأحاديث الأربعة** کے نام سے ہیں۔ ان کتب پر بعض علماء نے دینی اعتبار سے نقد کی ہے اور ان کے عقائد کو فاسد اور خلافِ اسلام قرار دیا ہے۔ انہوں نے '**مختار تفسير القرطبى**' کے نام سے تفسیرِ قرطبی کی ایک تلخیص بھی کی ہے۔

افکار و آراء

توفیق الحکیم پر ان کے بعض افکار کی وجہ سے تجدّد پسندی اور مغرب کی تقلید کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ایک اعتراض تو ان پر یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے بعض ڈراموں مثلاً '**أصحاب الكهف**' اور '**سليمان الحكيم**' میں قرآن وحدیث میں بیان شدہ قصص اور تفصیلات کی بجائے بائبل کی عبارات کو بنیاد بنایا ہے، جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سابقہ اقوام کے قصص اور تاریخ کے بیان میں ضعیف، موضوع، منکر اور ہر قسم کی روایات کو بنیاد بنانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ قدیم مصری فرعونی اور قبطی تہذیب اور فکر سے متاثر تھے اور اس تاثر کی جھلک ان کے ڈراموں '**أصحاب الكهف**' اور '**عودة الروح**' میں صریحاً نظر آتی ہے۔ بعض سلفی علماء نے ان پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بعض تحریروں اور ڈراموں کو وحدت الوجود کا عقیدہ پھیلانے اور عام کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

ان پر ایک اعتراض یہ بھی عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں مصری اخبار '**الأهرام**' میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ '**حديث مع وإلى الله**' کے عنوان سے ایک

تخیلاتی مکالمہ شائع کرنا شروع کیا جس میں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سوئے ادب کے مرتکب ہوئے ہیں۔بعض مصری علماء اور شیوخ نے ان پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس مکالمے میں وہ خود ہی اللہ سے ہم کلام ہوتے ہیں اور پھر اللہ کی طرف سے جواب بھی اپنے تخیلات اور افکار کے مطابق دیتے ہیں۔علماء کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص دعا اور مناجات میں اللہ سے ہم کلام ہو تو اس کی گنجائش تو موجود ہے لیکن اللہ سے کلام کے دوران اپنی ہی بات اور جواب کو اللہ کا جواب اور کلام قرار دیتے ہوئے اسے بطور مکالمہ شائع کرنا اللہ پر بہتان کے مترادف ہے۔ چونکہ توفیق الحکیم نے اپنے مکالمے میں اللہ کی طرف سے جو جواب دیا ہے وہ اللہ کا کلام یا جواب نہیں ہے لہٰذا اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف درست نہیں ہے۔

توفیق الحکیم کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ مغرب میں سائنسی علوم کے ماہرین اور موجدین کو کائنات میں غور وفکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت حاصل ہے اور اس کے عوض وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جنت میں داخلے کے لیے کلمہ شہادت کا اقرار کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ان پر یہ اعتراض بھی عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے آخرت میں اللہ کی رؤیت کا انکار کیا ہے۔توفیق الحکیم کا کہنا یہ بھی تھا کہ عربی اور یہودی فکر میں ثقافتی تعاون بڑھانا چاہیے اور امن وسلامتی کے حصول کی خاطر ایک عرب اسرائیل جمعیت کا قیام عمل میں لانا چاہیے جس کا صدر دفتر فرانس میں ہو۔

ان پر ایک اعتراض یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ ان کے بقول مذہب کی ابتدا کا سبب انسانی خوف بنا ہے اور عامۃ الناس نے اپنے خوف کے خاتمے کے لیے شریر ارواح سے رابطے کیے اور کہانت کا مذہب وجود میں آ گیا۔اس کے بعد اسلام کی ابتدا ہوئی اور اس نے اللہ، رسول اور کتبِ سماویہ کی تعلیمات سے متعارف کروایا۔ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے بقول تمام ادیان نسبی اور اضافی (relative) ہیں لہٰذا اپنی اپنی جگہ تمام ادیان صحیح ہیں۔اسی فکر کی بنیاد پر انہوں نے سماوی ادیان کے اتحاد واتفاق کی دعوت دی۔ان پر یہ اعتراض بھی وارد کیا گیا ہے کہ وہ اسلام اور اشتراکیت میں موافقت کے قائل تھے۔اسی طرح وہ شریعتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید کے بھی داعی تھے۔انہوں نے فرشتوں اور جنات کے عالم کے بارے بھی میں کچھ عجیب وغریب خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کے اس قسم کے افکار پر ڈاکٹر علی سید احمد سید نے اپنی ایک کتاب 'فکر توفیق الحکیم فی میزان الاسلام' میں مفصّل نقد کیا ہے۔

خلاصہ کلام

توفیق الحکیم کی کتب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اور اسلام کے بارے میں ان کی معلومات انتہائی ابتدائی اور سطحی تھیں لہٰذا وہ کسی طور بھی اس بات کے اہل نہیں تھے کہ فکرِ اسلامی جیسے دقیق اور نازک موضوع پر اپنی آراء وافکار کا اظہار فرماتے۔اگر وہ اپنی خدمات عربی زبان وادب تک ہی محدود رکھتے تو شاید علماء کو ان پر نقد کی ضرورت پیش نہ آتی۔ایسی شخصیات اور اعلام پر علماء کی طرف سے اسی وقت نقد سامنے آتی ہے جب یہ حضرات اپنے ادبی سیاسی، معاشرتی یا دنیاوی مقام کو بنیاد بناتے ہوئے اُمّتِ مُسلمہ کے رہنما بننے کی کوشش کرتے ہیں اور فکر اسلامی جیسے نازک موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عوام الناس میں فکری انتشار اور عقیدے کے بگاڑ کا باعث بن جاتے ہیں۔

مصادر ومراجع

(۱) طٰہٰ حسین فی میزان العلماء والأدباء، محمود مهدی إستنبولی، المکتب الإسلامی، الطبعة الأولی، ۱۹۸۳ء۔
(۲) فی الشعر الجاهلی، الدکتور طه حسین، مکتبة دار الندوة الألکترونیة۔
(۳) فکر توفیق الحکیم فی میزان الاسلام، الدکتورعلی سید احمد السید الفرسیسی
(۴) أعلام وأقزام فی میزان الاسلام، الدکتور سید بن حسین العفانی، دار ماجد عیری، جدة
(5)-http://ar.wikipedia.org (6) http://en.wikipedia.org

بقیہ حواشی: رسول اکرم ﷺ۔نبی رحمت

(۱۲) صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب جهنم اعاذنا الله عنها۔
(۱۳) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابةؓ، باب مواخاة النبی ﷺ......
(۱۴) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب استحباب صلوة الضحی۔
(۱۵) سنن ابی داوٗد، کتاب الحدود، باب عفو النساء عن الدم۔
(۱۶) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ......
(۱۷) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل ازالة الاذی عن الطریق۔
(۱۸) سنن ابی ابوداوٗد، کتاب الجهاد، باب مایؤمر به من القیام علی الدواب۔

دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کا مسئلہ

مولانا عصمت اللہ ☆

دینی مدارس کا وجود اس ملک اور قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم نعمت اور اس کی رحمت کے نزول کا باعث بھی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نعمت کی قدر کی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (ابراھیم:۷) کے مصداق اس میں اضافہ فرمائیں۔عصری تعلیمی اداروں کے برعکس دینی مدارس کی چند امتیازی خصوصیات ہیں جن کی نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۱) دینی مدارس میں پڑھائی کے لیے آنے والوں کی اکثریت کا تعلق غریب طبقہ سے ہے‘ جن کی تعداد تقریباً دس لاکھ ہے۔اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو مذکورہ تعداد میں سے چند ہیروئن اور دیگر منشیات میں مبتلا ہوتے اور کچھ کلینر یا ڈرائیور ہوتے‘ بعض شہر کی سڑکوں اور کچرہ دانوں میں روزی تلاش کرتے۔دیگر چوری‘ ڈاکہ زنی وغیرہ جرائم میں مبتلا ہوتے‘ جبکہ آج ان کی بڑی اکثریت پُرامن اور شریف شہریوں پر مشتمل ہے۔ملک کے جرائم پیشہ افراد میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ مدارس کی طرف سے قوم پر بڑا احسان ہے‘ کیونکہ اگر یہ تعداد مذکورہ منفی سرگرمیوں میں مبتلا ہوتی تو قوم کی کثیر تعداد ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔

(۲) اساتذۂ کرام انتہائی کم تنخواہ پر قناعت کرتے ہوئے بہت خلوص کے ساتھ تدریسی عمل میں حصّہ لے رہے ہیں‘ کیونکہ وہ اسے دینی فریضہ اور قومی خدمت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تقرری قابلیت اور دیانت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔کلاس میں اساتذہ کی موجودگی تقریباً سو فیصد ہوتی ہے جبکہ چھٹیاں بہت محدود ہوتی ہیں۔

(۳) امتحانات کا نظام بہت صاف وشفاف ہوتا ہے۔نقل‘ سفارش‘ پرچہ آؤٹ ہونا یا نمبروں میں ردّوبدل کرنا اور اس جیسی دوسری خرابیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔لہٰذا نمبر استحقاق اور

☆ اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامیات)‘ گورنمنٹ ڈگری کالج‘ کوئٹہ۔

قابلیت کی بنیاد پر ملتے ہیں۔

(۴) اخلاقی تربیت پر اتنی توجہ دی جاتی ہے کہ اس کے اثرات وہاں کے فارغ التحصیل لوگوں میں زندگی بھر نمایاں نظر آتے ہیں۔یہاں تک کہ اگر وہ کاروبار شروع کرتے ہیں‘ مثلاً تاجر بنتے ہیں تو ملاوٹ‘ دو نمبر اشیاء کی خرید وفروخت یا دیگر قسم کے فراڈ سے مکمل اجتناب کی کوشش کرتے ہیں۔اسی طرح ہر قسم کے کاروبار میں پاک اور صاف ہوتے ہیں۔

(۵) یہ ساری خدمات بہت کم خرچ میں ہوتی ہیں۔کفایت شعاری‘ وسائل کا بہتر استعمال اور انہیں ضائع ہونے سے بچانا اس نظام کی اولین ترجیح ہے۔

(۶) دینی مدارس چلانے والوں کا تعلق نظریاتی طور پر اگرچہ جمعیت علماء ہند سے ہے‘ جو پاکستان بننے کی مخالفت کرتی تھی‘ لیکن اس کے باوجود ملک کے ساتھ ان کی محبت‘ اخلاص اور وفاداری ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔آج تک کسی مدرسے کا فارغ شدہ ایک بھی طالب علم کسی غیر ملکی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہوئے منظر عام پر نہیں آیا ہے‘ نہ کسی پر اس قسم کا الزام ثابت ہوا ہے‘ حالانکہ بعض عناصر کو جب بھی موقع ملتا ہے تو اسی تعلق کو بنیاد بنا کر ان پر الزام لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ پاکستان کے وجود کے خلاف ہیں۔

(۷) دینی مدارس کی انہی خدمات کی وجہ سے اسلامی دنیا میں پاکستان کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسے اسلام کا قلعہ سمجھا جاتا ہے۔ساری اسلامی دنیا سے دینی علوم اور اسلامی تربیت کے حصول کے لیے لوگ نہ صرف اپنے بچے بلکہ بچیاں بھی یہاں بھیج دیتے ہیں اور یہ محبت وعزت اس قوم کے لیے باعثِ فخر سرمایہ ہے۔

(۸) پاکستان کی نظریاتی حیثیت کے تحفظ میں سب سے آگے وہی لوگ ہیں جن کا تعلق دینی مدارس سے ہے اور یہی لوگ ہیں جو قوم کو وقتاً فوقتاً یاد دلاتے ہیں کہ پاکستان بنانے اور ہندوستان توڑنے کا جواز صرف اور صرف پاکستان کا اسلامی نظریہ ہے اور اس ملک کے قیام کا مقصد ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ ہے۔جب بھی ملک میں اس نظریہ سے متصادم کسی قانون کے نفاذ کی کوشش ہوتی ہے تو اس کے خلاف سب سے پہلے یہی لوگ آواز اٹھاتے ہیں‘ جبکہ سیکولر نظریات کے حامل لوگ کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کی بنیاد مسلمانوں کی معاشی محرومی کو قرار دیں۔

لیکن ان سب کے باوجود چند زمینی حقائق ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ نظام اور یہاں کے پڑھے ہوئے افراد حالاتِ حاضرہ کے چیلنجوں کو قبول کرنے سے مناسب طور پر نہیں نمٹ

سکتے۔ اس لیے مدارس کے نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور بااختیار حضرات کو موجودہ نصاب میں تبدیلی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑے گا۔ جمود کو توڑنا اگرچہ مشکل کام ہے کیونکہ اکثریت اس سے مطمئن ہوتی ہے اور نئی تبدیلی پر شکوک وشبہات کا اظہار ہوتا ہے جنہیں دور کرنا یا برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں، لیکن پہلے چند باتیں اشارتاً بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ اور دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کے درمیان کس مسئلہ پر اختلاف تھا اور شیخ الہند کی زبان پر اکثر یہ شعر کیوں آجاتا تھا ۔

کامل اس طبقۂ زہاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!

اور مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کو دیوبند سے جا کر دہلی میں درس قرآن کے لیے ایک ادارہ کیوں قائم کرنا پڑا۔ مولانا سندھیؒ قرآن کی آیت ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:۱۹) سے کیا استدلال کرنا چاہتے تھے، جس کے بارے میں بعد میں مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے اعتراف کیا کہ سندھی صحیح کہہ رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک انسان ایک ہی کام یا مضمون میں مہارت کما حقہ حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ مزید کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے اسے نہیں دی ہے۔ شاذ ونادر ہی کوئی آدمی دوسرے کام میں بھی عبور حاصل کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور مقولہ ہے: لِكُلِّ فَنٍّ رِجَال ۔ ایک شعر کا حصہ ہے: **وللناس فيما يعشقون مذاهب**۔ مطلب یہ کہ ہر انسان میں ایک مخصوص کام کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور ایک چیز میں اس کا شوق ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج کی تاریخ تک یا مغرب کی نشاۃِ ثانیہ پر نظر ڈالی جائے تو مذکورہ بالا دعویٰ کی تصدیق آسانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر صحابہؓ میں ''عبادلہ ثلاثہ'' علمی لحاظ سے شہرت رکھتے ہیں، خاص طور پر فقہ میں۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ قاری، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ زاہد اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سپہ سالار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ امام ابوحنیفہؒ فقہ، امام بخاریؒ حدیث اور ابومنصور ماتریدی علم کلام اور سیبویہ نحو میں یکتا تھے۔ نیوٹن اور آئن سٹائن کی وجہ شہرت فزکس جبکہ فرائڈ کی نفسیات بنی۔ لہٰذا جس تعلیمی ادارے میں انسان کی اس فطری خصوصیت کا خیال رکھا جاتا ہے اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ عصری علوم کے تمام تعلیمی اداروں میں اس چیز کا

مکمل خیال رکھا جاتا ہے جن میں میٹرک کے بعد تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر مضمون کا ایک الگ شعبہ قائم ہوتا ہے اور طلبہ اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق کسی ایک شعبہ میں داخلہ لے لیتے ہیں، مثلاً میڈیکل، نان میڈیکل، فزکس، کیمسٹری، بیالوجی وغیرہ۔

تیسری بات یہ ہے کہ آج کل اسلامی علوم کے ہر مضمون کے مقابلے میں عصری علوم کا بھی ایک شعبہ موجود ہے، مثلاً اسلام کے فوجداری قانون کے مقابلے میں مغرب کا بھی فوجداری قانون موجود ہے۔ اسلامی معیشت کے مقابلے میں مغربی معاشی نظام ہے۔ اسی طرح سیاسی نظام کا معاملہ ہے۔ کائنات اور انسان کی پیدائش سے متعلق اسلامی نظریہ کے برعکس اُن کا اپنا نظریہ ہے۔ یہی حال انسانی نفسیات اور معاشرت کا ہے۔ ایک مسلمان عالم کے لیے مغربی نظریہ سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ اس کی وجوہات تو بہت ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر مناسب ہے۔ اسلامی ممالک میں قائم عصری تعلیمی اداروں میں مغربی نظریات پر مشتمل نصاب پڑھایا جاتا ہے اور ہمارے نوجوان ان نظریات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان کو مذکورہ اثرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان علماء ان علوم کی خامیاں اور ان کے مقابلے میں اسلامی علوم کی خوبیاں بتائیں۔ اس کے علاوہ اسلام ایک تبلیغی دین ہے۔ اس مقصد کے لیے مغربی علوم پر عبور حاصل کرنا چاہیے تاکہ اہل مغرب اور ان سے متاثر لوگوں کو دین کی تبلیغ کے وقت ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵) کی تعمیل میں ان کے سوالات اور شکوک وشبہات کا جواب تسلی بخش طریقہ پر دیا جاسکے، اور ان کو جس گھمنڈ اور برتری کا احساس ہے اسے زائل کیا جاسکے۔

آمدم برسر مطلب، کہ عربی مدارس کے نصاب میں مذکورہ امور کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ درس نظامی میں اسلامی علوم کے تمام شعبے شامل ہیں۔ چونکہ نصاب کی تکمیل کا وقت صرف آٹھ سال ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اتنے عرصے میں تمام مضامین تفصیل کے ساتھ نہیں پڑھائے جاسکتے، نہ ہی طلبہ ان کو ہضم کر سکتے ہیں، کیونکہ مدارس میں پڑھائے جانے والے مضامین کی تعداد تقریباً بیس ہے۔ اس لیے ہر مضمون کا گویا صرف نمونہ پڑھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر علم کلام میں صرف ''شرح عقائد'' اور علم معانی یعنی بلاغت وفصاحت میں صرف ''مختصر المعانی'' نصاب میں شامل ہے، حالانکہ اعجازِ قرآنی کی پہچان اسی علم پر موقوف ہے۔ اس علم پر مہارت کے بعد سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن واقعی معجزہ ہے۔ اس کے علاوہ اکثر کتابیں اتنی بڑی ہیں جنہیں

درسی سال کے دوران' جو تقریباً سات مہینے بنتے ہیں' مکمل کرنا ممکن نہیں۔ صرف ابتدائی یعنی سہ ماہی امتحان تک اطمینان سے تدریس ہوتی ہے' اس کے بعد شش ماہی امتحان تک استاد خود تو سمجھتے ہیں کہ وہ کیا پڑھا رہے ہیں لیکن طلبہ نہیں سمجھ پاتے۔ اور پھر شش ماہی کے بعد رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ استاد خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا پڑھا رہے ہیں۔ ہدایہ کی ہر جلد تقریباً چھ سو بڑے صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک جلد تقریباً گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ درسی دن کل ۲۱۰ ہیں۔ اتنے محدود عرصہ میں اتنی طویل کتابوں کا اطمینان سے پڑھانا محال ہے۔ یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا ہے۔ اصولِ حدیث میں ''نخبۃ الفکر'' اور اصول التفسیر میں ''الفوز الکبیر'' جو مختصر رسالے ہیں' پڑھائے جاتے ہیں' جن کے پڑھنے سے متعلقہ علوم میں ابتدائی معلومات تو حاصل ہو جاتی ہیں' لیکن مہارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر چونکہ فقہ اور حدیث کی کتابوں کی ترتیب بھی ایک جیسی ہوتی ہے اس لیے صرف ابتدائی حصّہ جو ''عبادات'' پر مشتمل ہوتا ہے وہی بار بار تسلی سے پڑھنے کا موقع ملتا ہے' جبکہ باقی موضوعات اخیر تک کما حقّہٗ نہیں پڑھے جا سکتے۔ چنانچہ صرف برکت کے لیے ایک طالب علم بلند آواز سے عربی عبارت پڑھتا ہے اور باقی طالب علم سنتے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح طالب علم ہر مضمون میں مہارت تو دور کی بات ہے' اسے سمجھنے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں طالب علم فراغت کے بعد قوم کو صحیح رہنمائی نہیں دے سکتا۔ اب اگر الگ الگ شعبے بنائے جائیں اور درجۂ رابعہ کے طالب علم کو یہ آزادی حاصل ہو کہ اپنی پسند کے شعبے میں داخلہ لے' مثلاً ایک شعبہ عبادات' دوسرا لغت' تیسرا عائلی معاملات یعنی نکاح اور اس کے متعلقہ علوم' چوتھا تجارت' اسی طرح حدیث' تفسیر' علم کلام وغیرہ۔ اب ایک طالب علم جب ایک شعبہ میں داخلہ لے گا تو اس میں مُتخصِّص یعنی اسپیشلسٹ بن سکتا ہے' کیونکہ اس طرح اس کو متعلقہ مضمون تفصیل سے پڑھنے کا موقع مل سکتا ہے۔

دوسری تبدیلی یہ ضروری ہے کہ اسلامی موضوعات کے مقابلے میں مغرب کا جو اپنا الگ فکر ہے اسے بھی شامل کیا جائے' مثلاً مغربی معاشی نظام' زرعی اور سیاسی مضامین' فوج داری قانون' کائنات اور حیاتیات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر پڑھانا بہت ضروری اور مفید ہے۔ مغربی مستشرقین کی کتابیں اسلامی علماء کے جوابات کے ساتھ نصاب میں شامل کی جائیں تو بہت مناسب ہے۔ اس قسم کی تبدیلیوں کے بہت مفید نتائج نکلیں گے۔ پہلے ایک بات کی

وضاحت کریں گے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ﴾ (النساء:۵۸)

''بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ امانت (یعنی عہدہ) اس کے اہل کے سپرد کر دینا۔''

اس آیۂ مبارکہ کی وضاحت میں بخاری شریف کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:

((اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ)) (۱)

''جب عہدے نااہل لوگوں کے حوالے کرنے کا سلسلہ شروع ہو جائے تو (اس خرابی کا کوئی علاج نہیں) بس قیامت کا انتظار کرو۔''

اور آج اس ملک میں کیا ہو رہا ہے یہ سب کو معلوم ہے۔ بہرحال اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ فرما رہے ہیں کہ ذمہ داری اور عہدہ اس کے اہل کو ملنا چاہیے اور اہلیّت کی شرط یہ ہے کہ جو کام ایک شخص کے سپرد کیا جا رہا ہے اس کی صلاحیت اس میں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ امانت دار اور دیانت دار ہو اور آپ ﷺ کے ارشادات سے واقف ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ)) (۲)

اب اگر ایک طالب علم دینی مدارس میں مذکورہ تجاویز کی روشنی میں تعلیم حاصل کرے تو پھر وہ گورنمنٹ کے ہر ادارے میں کام کرنے کے قابل ہوگا اور امانت داری اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے گا۔ آج ملکی اداروں میں اس قسم کے لوگوں کی ضرورت اور اہمیت سے ایک فرد بھی انکار نہیں کر سکتا اور ملک کے گھمبیر مسائل میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ لوگ معاشی مسائل کے ضمن میں پریشان نہیں رہیں گے۔ مدارس کے فارغ شدہ لوگوں کا یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں' اس کی وجہ سے ان کی پریشانی بھی دیدنی ہے اور اس کی وضاحت یہاں ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا)) (۳) ''قریب ہے کہ فقر کفر کی شکل اختیار کر لے''۔ رسول اللہ ﷺ سے منقول دعاؤں میں فقر کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ اس ضمن میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی حد تواتر بالمعنی تک پہنچی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))(۴)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے تقریرِ بخاری میں کہا ہے کہ جو شخص والدین کی نافرمانی کرتا ہے اس کو دنیا میں تنگدستی کی سزا ملتی ہے۔ مفتی رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ

مانگنے کا سوال بھی مکروہ ہے۔ دینی مدارس کی معاشی پریشانی بہت سارے لوگوں کے لیے اپنی اولاد کو دینی مدارس میں داخل کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ آج تقریباً ہر سال دس ہزار کے قریب افراد مدارس سے فارغ ہوتے ہیں اور ان کے روزگار کا میدان صرف اور صرف مسجد کی امامت اور مدرسے کی تدریس ہے' اور ظاہر بات ہے کہ مذکورہ تعداد صرف ان دو مواقع میں نہیں کھپائی جاسکتی' اس لیے اکثریت بے روزگار رہتی ہیں۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ حضرات میں اعتماد پیدا ہو جائے گا' چنانچہ وہ عصری علوم سے وابستہ لوگوں کو اعتماد کے ساتھ اور ان کی نفسیات کے مطابق دلائل سے اسلام کے بارے میں مطمئن کر سکیں گے اور دعوت دے سکیں گے۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ آج دینی تعلیم یافتہ اور عصری تعلیم یافتہ لوگوں کے مابین جو دوری ہے اس پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔

آخری گزارش

جہاں تک ہماری معلومات ہیں' پنجاب اور سندھ کے اکثر مدارس کے ذمہ دار حضرات اس قسم کی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں' بلکہ چند حضرات نے عملی قدم بھی اٹھایا ہے' لیکن خیبر پختونخوا میں قائم مدارس والے کسی بھی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس لیے وفاق المدارس کی انتظامیہ کو چاہیے کہ وفاق سے منسلک مدارس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں اور ہر حصہ کے امتحانات کا انتظام الگ الگ کر دیں' جیسے گورنمنٹ کے تحت بورڈ انگلش میڈیم اور اردو میڈیم کے لیے علیحدہ بندوبست کرتے ہیں۔ پرانے نظام کو برقرار رکھنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور اسی کے مطابق ان کے امتحانات کا سلسلہ جاری رکھیں اور جو مدارس تبدیلی کے خواہاں ہیں ان کو الگ کر کے ان کے نصاب کے مطابق ان کے امتحانات کا سلسلہ شروع کریں۔ **وھو الموفق**

حواشی

(١) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من سئل علما هو مشتغل فی حدیثه فاتم الحدیث ......

(٢) مسند احمد' ح ١١٩٣٥ و ١٢١٠٨ و ١٢٧٢٢ و ١٣١٤٥۔ الترغیب والترهیب للمنذری' ج٤' ص ٧٧۔ راوی: انس بن مالك ﷺ۔

(٣) تخریج الاحیاء للعراقی : ٢٣١/٣۔ والمقاصد الحسنة للسخاوی: ٣٦٨' راوی : انس بن مالك ﷺ - فی اسناده یزید الرقاشی ضعیف۔

(٤) صحیح البخاری' کتاب الزکاة' باب له صدقة الاعن ظهر غنی۔ وصحیح مسلم' کتاب الزکاة' باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلی......

سلف صالحین کے حوالے سے راہِ اعتدال

مولانا ابوالکلام آزاد

صحیح راہ حق و اعتدال کی یہ ہے کہ دو اصل ہیں اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب و سُنّت و نصوصِ شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیے اور اِسی پر حکم و عمل کرنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ تمام ائمہ اسلام اور علمائے حق سے حسن ظن اور محبت و ارادت رکھنی چاہیے اور اُن کے مراتب و حقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن و تناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں اور بدبختانہ لوگوں نے ہمیشہ اِنہی میں افراط و تفریط کی ہے یا دونوں میں سے صرف کسی ایک ہی کے ہو رہے ہیں۔

ایک جماعت احکام و نصوصِ شرعیہ کے اتباع و تقدیم کا یہ مطلب سمجھتی ہے کہ جہاں کسی اہلِ علم و حال کا کوئی قول بظاہر کسی حکم و نص کے خلاف نظر آیا' بلا تأمل تضلیل و تکفیر پر آمادہ ہو گئے۔ جھٹ حکم لگا دیا کہ وہ منکرِ شریعت ہے' اگرچہ اُس نے اپنی ساری زندگی شریعت کے علم و عمل میں بسر کر دی ہو۔

دوسری جماعت نے ائمہ و اکابرین کی پیروی اور محبت و اعتقاد کے یہ معنی سمجھے کہ احکام و نصوص کو اُن کا تابع و محکوم بنا دیا جائے۔ چند غیر معصوم انسانوں کی خاطر کتاب و سنت کو ترک کر کے ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (اُنہوں نے اپنے علماء و صوفیاء کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔ التوبہ: ۳۱) کی سرحد سے قریب ہو گئے۔ اِس دوسری جماعت کا عجیب حال ہے۔ یہ جب کبھی اپنے پیشواؤں کے کسی قول کو احکام و نصوصِ شرعیہ کے خلاف دیکھتی ہے تو اِس کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتی کہ قرآن و سنت کو مقدم رکھ کر اس قولِ مخالف کی تاویل کرے اور اِس طرح شریعت الٰہی کو بھی اپنی جگہ چھوڑنے کی زحمت نہ دے اور پیشوایانِ اسلام کے دامن کو بھی مخالفتِ شریعت کے دھبے سے بچائے۔ بلکہ اِس کے برعکس کوشش کرتی ہے کہ اپنے پیشواؤں کی باتوں اور آراء کو مقدم رکھ کر کسی نہ کسی طرح قرآن و حدیث کو اُن کے مطابق کر دکھائے' اگرچہ ایسا کرنے میں تاویلِ نصوص' تحریف نصوص تک پہنچ جائے!

پہلی راہ اصل کے اعتبار سے راہِ یہود ہے اور دوسری راہِ نصاریٰ۔ اسلام نے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝﴾ کے الفاظ سے دونوں کی نفی کی۔ ایک حدیث میں مجدّدینِ امت کا یہ کام بتلایا کہ ((يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ)) (السنن الکبرٰی للبیھقی) سو پہلی راہ انتحال المبطلین کی ہے اور دوسری تأویل الجاھلین کی۔ پہلی جماعت کو گمراہی نے بغض و انکار کا چہرہ دکھلا کر بھٹکایا اور دوسری کو محبت و اتّباع کے نقاب میں آ کر راہِ حق سے ہٹایا۔ دُنیا میں جس وقت سے نوعِ انسانی آباد ہوئی ہے ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس رہے ہیں۔ یا افراطِ بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراطِ محبت نے' ناهید بغمزه کشت و مریخ بقهر۔

اہلِ حق کی صراطِ مستقیم ان دونوں سے الگ ہے' میانِ کعبہ و بُت خانہ راہیست۔ وہ ہر حال میں احکامِ شریعت اور ظواہر کتاب و سنت کو مقدم رکھتے ہیں اور اِس تمام کائناتِ ہستی میں صرف اُنہی کو واجب الاطاعت یقین کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی تمام اہل علم و ائمہ اسلام سے حسنِ ظن و عقیدت بھی رکھتے ہیں اور اُن کے جو اقوال و آراء یا احوال و سوانح بظاہر نصوصِ کتاب و سنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اُن کی وجہ سے یکایک سرگرمِ انکار و تضلیل نہیں ہو جاتے بلکہ حتی الوسع اُن کی تاویل کرتے ہیں اور ایسی راہِ تعبیر ڈھونڈتے ہیں جو نصوصِ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر دیکھتے ہیں کہ کسی طرح اختلاف دور نہیں ہو سکتا' تو اُن کی خاطر نصوصِ شرعیہ کو اپنی جگہ چھوڑ کر مُاوّل ہونے کی زحمت نہیں دیتے کہ یہی بنیادِ تحریف ہے۔ بلکہ یا تو اُن عذرات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اِس اختلاف پر مجبور ہوئے اور یا پھر اُن کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر کے اُن کا معاملہ عالم السرائر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مگر نہ تو اُن کی پیروی و حمایت کرتے ہیں اور نہ اُن کی وجہ سے صاحبِ قول و حال کے حقوقِ اسلامی و مراتب فضیلتِ علم و عمل کو نظر انداز کر کے آمادۂ انکار و تضلیل ہو جاتے ہیں۔ کسی غیر معصوم کا قابلِ احترام و اتباع ہونا اِس کے لیے مستلزم نہیں کہ اس کا ہر قول و حال حجّت ہو اور نہ کسی غیر معصوم کے کسی ایک قول و اجتہاد کا غلط ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے تمام محاسنِ اقوال و اعمال کو ترک کر دیا جائے۔

قرآن حکیم نے سچے مومنوں کی جو شان بتلائی ہے وہ اُن کی اس طلب و دعا سے ظاہر ہے: ﴿لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾۔ پس جب عام مومنوں کی نسبت یہ حکم ہے تو

اصحابِ علم وفضیلت کی طرف سے دل میں غِل وبغض کا ہونا کب جائز ہوسکتا ہے! البتہ اصل مرکزِ حق ویقین کتاب وسنت ہے۔ یہ مرکز اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا اگرچہ سب کو اِس کی خاطر اپنی جگہ سے ہل جانا پڑے۔ اِس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا اور سب کی چوکھٹیں اِس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گی۔ ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (بخاری)۔ جب نصِ رسول کے مقابلے میں کسی دوسرے انسان کی پاسداری کی تو رسول ''اَحَبَّ'' کب باقی رہا؟ اربابِ افراط وغلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے احوال واقوال کو بمنزلہ اصل مرکز بنا لیتے ہیں جس کو کسی حال میں اُس جگہ سے نہیں ہلایا جاسکتا' اور پھر چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی وصاحبِ وحی کی نص کو اُس کی جگہ سے ہٹا کر اپنے خودساختہ مرکز تک لے جائیں۔ نہ جاسکے تو زبردستی کھینچ کر لے جائیں۔ اِس پر ستم یہ کہ اِس طریق کو طریق توفیق وتطبیق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ تطبیق ہے تو وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ کہ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا اور نہ کبھی اہلِ کتاب نے اِس دنیا میں تحریف کی۔ ○○

ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ کی

خصوصی اشاعت

بیاد: ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ

(نامور اہلِ علم، معاصرین، تلامذہ اور متعلقین کے قلم سے عصر حاضر کے ایک جید عالم اور محقق کے احوال وخدمات اور افکار وتحقیقات کا تذکرہ)

☆☆☆

صفحات تقریباً چھ سو۔ ہدیہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ) 200روپے

برائے رابطہ: ناظم ترسیل ماہنامہ الشریعہ، جامع مسجد شیرانوالا باغ، گوجرانوالہ

(0306-6426001)

میں آ مر جنم لیتے ہیں اور وہ ظلم وستم ڈھاتے ہیں۔ مغربی جمہوریت نے فرد کی بجائے ادارے قائم کیے اور پھر انہیں خوب مستحکم کیا۔ جب اداروں اور ریاستوں میں کج فکری اور کج روی پیدا ہوگی' جب قومی سطح پر ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کی سوچ پیدا ہوگی تو اجتماعی تکبر جنم لے گا۔ انہیں چونکہ وقفہ وقفہ سے اپنے عوام سے ووٹ لینا ہوتا ہے لہٰذا انہیں خوش رکھنے کی غرض سے دوسرے ممالک کی لوٹ مار کی جاتی ہے' وہاں ظلم وستم کا بازار گرم کیا جاتا ہے اور ریاستی تشدد جنم لیتا ہے۔ لہٰذا ہیروشیما اور ناگاساکی کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ شمالی کوریا اور شمالی ویت نام میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ فلسطین اور کشمیر میں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ لیکن پھر افراد کی بجائے ممالک کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دے کر اللہ ان کی رسی بھی کھینچ لیتا ہے۔ چنانچہ جس طرح تیونس کے سیاہ وسفید کا مالک ایک سبزی فروش ریڑھی بان کے ہاتھوں شکست کھا کر ملک سے فرار ہوتا ہے اور جس طرح مشرف اور جرنیلوں کا ٹولہ غیر مسلّح چیف جسٹس سے شکست کھا کر ملک بدر ہوتا ہے اور مغرب میں بھی چھپتا پھرتا ہے' اسی طرح امریکہ جیسی سپریم پاور آف دی ورلڈ ایٹم بم' ہائیڈروجن بم اور ڈیزی کٹر بموں اور سمارٹ بموں سے مسلّح ہونے اور قریباً ۳۴ دوسرے ممالک کی اسلحی' مالی' افرادی اور اخلاقی مدد حاصل ہونے کے باوجود آج دنیا کے پسماندہ ترین ممالک کی فہرست میں اول قرار دیے جانے والے افغانستان کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھا رہا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جدید نمرود کی ناک میں مچھر داخل ہو کر اس کے دماغ میں جا گھسا ہے۔ یہ ریاستی تکبر کا نتیجہ ہے کہ آج امریکہ دنیا کو کئی بار مکمل تباہ کرنے کی قوت رکھتے ہوئے طالبانِ افغانستان کی مذاکرات کے لیے منتیں کر رہا ہے۔ مالی طور پر امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ مقروض ملک ہے اور گوانتانا موبے اور ابوغریب میں اس کی گھٹیا حرکات بتاتی ہیں کہ وہ اخلاقی دیوالیہ پن کا بھی شکار ہے۔ کاش انسان جان لے کہ کبر اللہ تعالیٰ کی چادر ہے' جس نے یہ چادر کھینچی' وہ فرد ہو' معاشرہ ہو یا ریاست' ذلت ورسوائی اس کا مقدر ہے' جو ٹل نہیں سکتا۔ اس حقیقت کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کس خوبصورتی سے کر دی ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!